(جلد ۶) - اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ء - نمبر (۱)

ایڈیٹر
شیخ عبد القادر بی - اے

مخزن

مضامینِ اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامینِ نثر

حیاتِ جاوید پر ایک تنقیدی نظر - ایڈیٹر - ۱
ستر دلبراں - مہوش — ۱۲
انگریزی شاعری کا ایک ورق - مولوی سید علی سجاد
از عظیم آباد — ۱۷
ہمارا معشوق - سید علمدار حسین واسطی (از بنوں) ۲۱
اُردو زبان پنجاب میں - شیخ محمد اقبال ایم - اے ۲۵

مضامینِ نظم

اچھے کپڑے - مرزا عبد الغنی ارشد گورگانی - ۴۱
تصفیۂ لقا - چوہدری خوشی محمد بی اے ۴۴
نوحہ رشید [illegible] ۵۰
استق[illegible] بی اے مرحوم ۵۱
قصیدہ [illegible] مظفر علیخاں بی اے ۵۴
تازہ غزلیں - ۵۵ کچکول - ۵۸

نو کروڑ ہندوستانی اُردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اُردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اُردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اُردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اُردو سمجھی جاتی ہے

کارخانہ پیسہ اخبار کی خادم التعلیم سٹیم پریس میں منشی محمد عبد العزیز سپرنٹنڈنٹ کے اہتمام سے چھپا اور شیخ عبد القادر بی - اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا -

Rs:-

پانچ ہزار روپیہ انعام — ممیرے کا سُرمہ — پانچ ہزار روپیہ انعام

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں - والیان ریاست اور ولائت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ یوروپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے - کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے:-

ضعف بصارت - تاریکی چشم - دھند - جالا - پڑوال - غبار - پھولا - سبل سُرخی - ابتدائی موتیابند - پانی جانا - خارش وغیرہ

معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اب اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں - چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے - اور عینک کی حاجت نہیں رہتی - بچہ سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے - قیمت اسقدر کم رکھی گئی ہے کہ خاص و عام اس سرمہ سے فائدہ اٹھائیں - قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے - مبلغ عہ - ممیرے کا سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ مبلغ [illegible] - خالص ممیرہ فی ماشہ مبلغ عہ - بیس روپیہ - مصری سرمہ فی تولہ [illegible] - خرچ ڈاک بذمہ خریدار - درخواست کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں - نقلی و جعلی ممیرے کے سرمہ کے اشتہاروں سے بچنا چاہئے -

المشتہر

پروفیسر متا سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

…ن سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہوسکتی ہے

۱- میں نے ممیرے کا سرمہ جو سردار متا سنگھ نے تیار کیا ہے - ان مریضوں پر جنکی آنکھیں بہت کمزور اور بیمار تھیں استعمال کر کے دیکھا مفید پایا - میری رائے میں خاصکر ان مریضوں کے واسطے جنکے پانی جاتا رہتا ہے اور دھند - غبار - کمزوری نظر ہو یہ سرمہ نہایت مفید ہے

المشتہر

ڈاکٹر بیج لال گھوش رائے بہادر ایل - ایم - ایس اسسٹنٹ سرجن پروفیسر میڈیکل کالج لاہور حال انگریزی سرجن گورنر جنرل

۲- میں نے آپکا سرمہ آنکھوں کی بہت سی بیماریوں میں استعمال کیا بہت مفید پایا - خاصکر کاریا اور گورنو گرا اور تنلیوں کی بیماریوں میں تو بہت ہی مفید ثابت ہوا - میں آنکھوں کی ہر ایک قسم کی بیماری میں اس کو استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں

راقم ڈاکٹر [illegible] میڈیکل آفیسر شفاخانہ ریاست نیپال

۳- جناب سردار صاحب جو پیکٹ سرمہ ممیرہ کا بغرض تجربہ آپنے میرے پاس بھیجا تھا - اس کو میں نے اپنے چند مریضوں پر استعمال کیا بہت مفید پایا - میری رائے میں آپ کا ایجاد شدہ سرمہ سوزش چشم اور کمزوری نظر اور [illegible] کے لئے نہایت مفید ہے - **راقم**

ڈاکٹر [illegible] صاحب پروفیسر میڈیکل کالج آگرہ -

۴- جناب پروفیسر صاحب! تسلیم - آپ کا سرمہ ایک مریض پر استعمال کیا - جس کو عرصہ سے دھند - ناخونہ تھا - [illegible] وغیرہ سے بھی فائدہ نہ ہوا - مگر آپ کے سرمہ کے ایک ہفتہ کے استعمال سے کلی صحت ہو گئی -

راقم

ڈاکٹر خورشید علی [illegible] مقام دیوبند

پانچ ہزار روپیہ انعام

اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمے کی سندات میں سے جو قریب بیس ہزار کے ہیں - ایک کو بھی فرضی ثابت کر دیوے تو اس کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ کا انعام دیا جاوے گا - جو لاہور کے نیشنل بنک میں اسی مطلب کے لئے سنہ ۱۹۰۹ء میں جمع کیا گیا ہے -

لالہ سري رام ايم-اے

مخزن

حیاتِ جاوید

پر

ایک تنقیدی نظر

سنہ ۱۹۰۱ء میں اُردو علمِ ادب کے سرمایہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا۔ یعنی مولانا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی جیسے مشہور مصنف کے قلم سے سرسید احمد خانِ مرحوم جیسے نامور محسنِ ملک و قوم کے حالاتِ زندگی ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔ جسکا نام "حیاتِ جاوید" تھا۔ یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اِس سے موزون تر نام ایسی کتاب کے لئے ملنا مشکل ہے۔ اِس ملک میں اور زمانۂ حال میں اگر کسی مسلمان سے ایسے کام بن پڑے ہیں جن کے سبب وہ جاودانی زندگی کا مستحق ہو اور اُس کا نام قائم رہے۔ جب تک کہ مسلمانانِ ہند قومی حیثیت سے زندہ ہیں۔ تو وہ سرسید احمد خاں تھا۔ اور اُس کی حیات کے سوانح کو "حیاتِ جاوید" کہنا بالکل حق بجانب ہے۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی مقبول ہوئی۔ بلکہ شائد یہ کہدینا داخلِ مبالغہ نہیں کہ چھپنے سے پہلے مقبول ہو چکی تھی۔ لوگ اس کے منتظر تھے۔ اسکا مطبع سے نکلنا تھا۔ کہ قبولِ عام استقبال کو دوڑا۔ اور ہر دلعزیزی نے قدم لئے۔ دام بھی حجم اور حسنِ طبع کے اعتبار سے زیادہ نہ تھے۔ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ بعض بڑھیا قسم کی جلدیں تو بہت جلدی ہو چکیں اور جو باقی تھیں وہ رفتہ رفتہ بکتی جاتی ہیں۔ گو اُس کامیابی کی جو کسی ایسے مصنف کی کتاب

کو جس میں کسی ایسے یگانۂ روزگار کے حالات درج ہوں۔ انگلستان جیسے ملک میں ہوتی۔ تو توقع ہی نہ تھی۔ مگر اس ملک کے اعتبار سے جس قدر کی نگاہ سے اس کتاب کو دیکھا گیا اور جو کامیابی اسے ہوئی۔ وہ بہت غنیمت ہے اور یہ امید دلاتی ہے کہ وہ زمانہ روز بروز قریب آتا جاتا ہے کہ جب عمدہ اور مفید کتابیں زبانِ اردو میں بکثرت لکھی جائینگی اور بکثرت بکیں گی۔ ہم اس کتاب کے قابل اور واجب التعظیم مصنف کو اس کامیابی پر صدقِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اگر طبعِ ثانی کی نوبت آئے تو انہیں اس سے بھی زیادہ کامیابی ہو۔ کیونکہ یہ اوراق سالہا سال کی جگر کاوی کا نتیجہ ہیں۔ اور مدتوں مولانا حالی اس دھن میں رہے ہیں کہ سرسید کی سوانح عمری لکھیں۔ جب کہیں جاکر یہ جلد تیار ہوئی ہے۔

یہ کتاب شائع ہوتے ہی مخزن کو بہ غرضِ تنقید عطا ہوئی۔ ہم نے اسے بہ غور پڑھا۔ اور پڑھکر حضرتِ مصنف کو اطلاع دی۔ کہ اس پر بہت آزادانہ اظہارِ رائے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے بہ کمالِ دریا دلی اجازت دی۔ کہ پوری آزادی سے تنقید لکھی جاوے۔ یہ اجازت ہمارے ملک میں ہر مصنف نہیں دیسکتا۔ یہ مولانا حالی کا ہی حصہ تھا۔ موجودہ زمانہ کے سرکردہ اہل قلم میں مولانا ہی پہلے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے اپنی کتابوں میں انگریزی کے آزادانہ رنگ میں تنقید کے لئے قلم اٹھایا ہے اور منصفانہ رائیں دی ہیں۔ اس لئے یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کی سب سے بڑی تصنیف پر ہی مخزن میں سب سے پہلے اس قسم کی بے دھڑک رائے لکھی جاوے۔ جس کی ملکی علم ادب کی ترقی کے لئے ضرورت ہے اور جس کے کبھی کبھی لکھتے رہنے کا ہم نے ایک ابتدائی مضمون میں جو بہ عنوان "فنِ تنقید" شائع ہوا تھا۔ وعدہ کیا تھا۔ اتنے عرصہ تک سکوت اس لئے اختیار کیا گیا۔ کہ کہیں آزاد تنقید کا مضر اثر کتاب کی خریداری پر نہ پڑے۔ کیونکہ باوجود اس ساری نکتہ چینی کے جو اس کتاب پر ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اردو میں اس ضخامت اور خوبی کی اپنی قسم کی پہلی ہی کتاب ہے۔ جس کا پڑھنا ہر اردو خواں کے لئے بالعموم اور

ہر مسلمان کے لئے بالخصوص نہائت ضروری اور مفید ہے - اب چونکہ کافی عرصہ اس کو چھپے ہوئے گذر چکا ہے اور ایک معقول حد تک خریداری ہو چکی ہے - اب ہم چاہتے ہیں - کہ بالکل صفائی سے اُن خیالات کا اظہار کر دیں - جو اس کو پڑھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوئے تھے - اور جنکا قابل مصنف تک پہنچنا خالی از فائدہ نہ ہوگا - کیونکہ ممکن ہے - کہ اگر بعض نکات پر اُن کی رائے ہماری رائے سے متفق ہو تو طبع ثانی اُن نقائص سے جو اِس کتاب میں رہ گئے ہیں - مبرا ہو کر نکلے - اور آئندہ کے لئے تنقید کا راستہ صاف ہو جائے - اور لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے - کہ جب وُہ تمام عقیدت اور ارادتمندانہ خلوص جو ہم مولانا موصوف سے رکھتے ہیں - ہمیں اُن کی کتاب پر آزادانہ تنقید لکھنے سے روک نہیں سکے - تو بہ دیگراں چہ رسد - اگر ہمارے ہاں کتابیں بھیجیں تو صاف صاف باتیں سننے کے لئے تیار رہیں - یہ ممکن ہے کہ کبھی ہماری صاف گوئی غلطی پر مبنی ہو - مگر یہ کوشش کیجائیگی کہ جو کچھ کہا جائے ایمانداری سے کہا جائے اور بے لاگ ہو -

جہاں یہ بات تعجب خیز ہے کہ سید احمد خاں جیسے فرید الدہر کے انتقال کے بعد صرف ایک کتاب اُردو زبان میں اس کے حالات پر لکھی جائے - وہیں یہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں - کہ "حیاتِ جاوید" کی سی کتاب پر اِس قدر تھوڑے "ریویو" لکھے جائیں - یُوں تو کئی اخباروں میں مختصر تعریف رسمی طور پر چھپ گئی ہوگی - مگر جہاں تک ہمیں علم ہے - صرف تین چار مشہور اہل الرائے حضرات نے اس پر بسیط رائیں لکھیں - ان میں سب سے پہلی اور سب سے مفصل رائے رسالہ معارف میں (جس کے بند ہو جانے پر رہ رہ کے افسوس ہوتا ہے) اسکے لائق ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم نے لکھی تھی - جو مولانا حالی کے ارشدِ تلامذہ میں ہیں - اُنہوں نے کتاب کی تعریف کا تو حق ادا کر دیا - مگر تصویر کے دُوسرے رُخ پر یا تو جوشِ ارادت نے انہیں نظر ڈالنے کی اجازت ہی نہیں دی - یا انہوں نے کتاب کو انگریزی رسمِ تنقید کی عینک لگا کر نہیں دیکھا - اور انگریزی سوانح عمریوں کے معیار سے نہیں جانچا -

اس کے سوا ایک ریویو علیگڈھ گزٹ میں شمس العلما مولوی ذکاراللہ صاحب کے قلم سے نکلا تھا۔ مگر وُہ تو بالکل مایوسی بخش تھا اور جس قسم کے "ریویو" کی توقع اُن سے ہوسکتی تھی۔ اُس کے برعکس تھا۔ ہاں ایک قابلِ قدر تنقید نہایت برجستہ الفاظ اور شُستہ عبارت میں ضلع علیگڈھ کے ایک فاضل رئیس مولوی حبیب الرحمٰن خاں۔ حسرت۔ شروانی نے لکھی تھی۔ جو لفظ تنقید کی مستحق تھی۔ مگر وُہ کتاب کے صرف ایک پہلو کا موازنہ تھا۔ اور اُس میں زیادہ تر اُس حصۂ کتاب پر اعتراضات تھے۔ جو سرسید مرحوم کی مذہبی حیثیت سے متعلق تھا۔ اور جس میں خانصاحب موصوف کے تردیک مولانا حالی طرفداری سے جو مورخ اور سوانح نگار سے کوسوں دُور ہونی چاہیئے۔ پُوری گریز نہیں کرسکے تھے۔ گو اس بارہ میں خانصاحب کے خیالات سے جو اُس مضمون میں ظاہر ہُوئے تھے ہمیں پُورا اتفاق نہ ہو۔ تاہم انہیں بہ حیثیتِ مجموعی درست سمجھتے ہیں اور اِس لئے تنقید کے اس ایک پہلو پر اس مضمون میں کچھ نہیں لکھینگے۔ یہ فرض حسرت شروانی بخوبی ادا کر چکے ہیں۔ ہم اِس کتاب کو سوانح نگار اور ادیب کی نظر سے دیکھینگے اور جو نقص ان اعتبارات سے اس میں نظر آئینگے۔ وُہ ظاہر کرنے کی کوشش کرینگے۔

مشہور لوگوں کے سوانح عُمری پر کتابیں لکھنا خصُوصاً اُس طرز میں جو اُردو میں مولانا حالی نے اختیار کی ہے۔ ہندوستان میں ابھی ایک جدید فن ہے۔ جو مغرب سے مُستعار لیا گیا ہے اور جس کے اعلےٰ نمونے اس وقت مغربی زبانوں کے ادبیہ ذخیروں میں موجود ہیں پس اگر سوانح عمری کے متعلق کسی تصنیف کو جانچتے ہُوئے ہم مغربی معیار پیشِ نظر رکھیں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ انگریزی میں بہترین سوانح عمری وُہ گنی جاتی ہے۔ جس میں ممدوح کی بولتی چالتی تصویر دکھادی جائے۔ اور زمانہ حال میں کئی اس قسم کی کتابیں وہاں لکھی گئی ہیں۔ مگر سب سے پہلی کتاب جس نے اس بارہ میں انگلستان میں شہرت حاصل کی اور جو شہرت لازوال ثابت ہوئی ہے۔ وُہ باس ول صاحب کی تصنیف کردہ "حیاتِ جانسن" ہے۔ ڈاکٹر جانسن اٹھارھویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں۔ اُنہوں نے انگریزی زبان کی سب سے

پہلی اور مستند لغت تصنیف کرنے سے نام پیدا کیا اور ویسے بھی انکی بہت سی تصانیفِ نظم ونثر متداول ہیں - انکی زندگی - طرزِ بود و باش - رفتار گفتار - تقریر تحریر کا جو سچا اور ہو بہو چربا باس ول نے اُتارا ہے - وُہ اسی پر ختم ہے - باس ول گو مولانا حالی کی طرح اپنے مُلک کے مشہور اہلِ قلم میں سے نہ تھا - اور نہ "حیاتِ جانسن" کے سوا کوئی اور کتاب باعثِ شہرت چھوڑ مرا ہے - مگر "حیاتِ جانسن" لکھنے میں اُس نے سوانح نگاری کے مراتب ایسی خوبی سے ادا کئے ہیں - کہ خود اپنے لئے بھی ایسا نام پیدا کر گیا - کہ کہا جاتا ہے کہ جب تک انگریزی زبان زندہ ہے - اُس کا نام بھی زندہ رہیگا - اس کامیابی کا کیا راز تھا - صرف یہی کہ جس دن سے اُسے خیال پیدا ہوا کہ جانسن کی حیات لکھی جاوے - اُسی دن سے اُس نے اپنے آپ کو جانسن کے ساتھ وابستہ کر لیا - سفر میں حضر میں ہر وقت ساتھ رہتا - اس کی حرکات وسکنات کو بغور دیکھتا - اور انکا گہرا نقش صفحۂ دل پر جماتا - اُس کی باتوں کو بہ غور سُنتا اور انہیں کانوں کے قُدرتی فونوگراف[۱] میں بند کر لیتا - گھر پہنچتے ہی وُہ نقوش صفحۂ دل سے صفحۂ کاغذ پر اُتر آتے - اور وُہ آوازیں گوشِ ہوش کی امانت سے نکل کر حوالۂ نوکِ قلم ہو جاتیں - مدتوں یہ سلسلہ جاری رہا - اور آخرش یہ مواد ترتیب پا کر اُس دلپذیر صُورت میں آیا جسے ہم اب دیکھتے ہیں اور دیکھ کر عش عش کرتے ہیں - مولانا حالی کو اوّل تو وُہ مواقع سید احمد خاں مرحوم کے ساتھ رہنے کے میسر نہ تھے - لیکن جس قدر موقعے پھر بھی اُنہیں ملے اُن میں اگر اُس نظرِ غائر سے کام لیا جاتا - جو باس ول نے اپنے ممدوح کے دیکھنے کے لئے پائی تھی - تو بہت کچھ ہو جاتا - مگر مولانا معذور تھے - انگریزی خیالات اور علوم سے تو اُنہیں سوائے بالواسطہ واقفیت ہونے کے براہ راست مَس نہ تھا اور خود اُردو فارسی میں یہ خیالات سوانح عمریوں کی نسبت موجود ہی نہ تھے - اُنہوں نے نئے رنگ میں جو کچھ کیا اُن کی پرانے زمانہ کی تربیت اور محدود انگریزی معلومات کے لحاظ سے تعجب خیز ہے - مگر

(۱) فونوگراف - آج کل تو مشہور چیز ہے - ایک آلہ ہے جس میں آواز اسی طرح بند کر لی جاتی ہے کہ جب کبھی ضرورت ہو پھر وہی آواز سُنی جا سکے -

سوال تو یہ ہے کہ آیا "حیاتِ جاوید" بہ حیثیت سوانح عمری ایسی چیز ہے۔ جیسی ہونی چاہیئے۔ یا اس سے کم۔ ہمارا جواب یہ ہے۔ کہ "حیاتِ جاوید" اُس پایہ کی سوانح عمری نہیں۔ جو چاہیئے تھا اور ابھی ہماری زبان میں سوانح عمریاں لکھنے کے طریق میں بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ "حیاتِ جاوید" کا بیشتر حصہ سرسیدِ مرحوم کی بیرونی زندگی اور امورِ رفاہِ عام کے ساتھ ان کے تعلقات کے بیان سے گھرا ہوا ہے اور اس سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا۔ کہ اسکو پڑھ کر وہ شخص جسے پہلے مرحوم کی نسبت کچھ معلوم نہ ہو اور جس نے انہیں دیکھا بھی نہ ہو۔ معقول اندازہ لگا سکے۔ کہ وہ بہ حیثیتِ انسانی کس پایہ کا آدمی تھا۔ اس میں بزرگی کی کیا کیا علامتیں تھیں۔ اُس کی بزرگی کے کیا کیا اسباب تھے۔ اور اس کے بچپن میں کچھ شہادت بڑے ہو کر بڑا آدمی بننے کی موجود تھی یا نہیں۔ گویا یہ حیات نہ صرف ایک تصویر کی حیثیت سے غیر مکمل ہے۔ بلکہ ایک بڑے آدمی کی بڑائی کا آغاز سے لیکر انجام تک سلسلہ دکھانے سے قاصر ہے اور انگریزی میں ایک کامیاب سوانح عمری کا یہ جزو ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ملک میں کسی مشہور آدمی کی اوائل عمر کے صحیح حالات جمع کرنا بہت سی مشکلات رکھتا ہے۔ اور یہ دقت ہمارے ملک میں اور بھی زیادہ ہے۔ لیکن یہی وہ حصہ سوانح عمری لکھنے کے کام کا ہے۔ جس پر سوانح نگار کو اپنی پوری ہمت اور توجہ صرف کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اسی حصہ کے واقعات میں ممدوح کی آئندہ بڑائی کے راز چھپے ہوتے ہیں۔ اور اسی سنگلاخ زمین کے کھودنے سے سوانح نگار کو کامیابی کے جواہر بے بہا مل سکتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ کہ باوجود اس امر سے واقف ہونے کے کہ بچپن کا اثر بقیہ زندگی پر کیا ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود اپنی کتاب میں ایک جگہ بہ وضاحت لکھتے ہیں۔ مولانا حالی نے سیّد احمد خان مرحوم کے بچپن کے متعلق یہ کیونکر باور کر لیا۔ کہ اُن کے بچپن میں جسمانی صحت کے سوا کوئی ایسی خصوصیت جس سے اُن کے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف

فوقیت دی جاسکے۔ نہیں پائی جاتی تھی۔ یعنی جیسے کہ بعضے بچے ابتدا میں نہایت ذکی اور طبّاع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ اُن میں کوئی اِس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا" خود "حیاتِ جاوید" میں جہانتک حالات سید احمد خان کے بچپن کے درج ہوتے ہیں۔ اُن میں اندرونی شہادت اُن کی ذہانت۔ طبّاعی۔ اور تیزی کی کسی حد تک موجود ہے اور ہم یقین کامل رکھتے ہیں۔ کہ اگر کسی طرح سے زیادہ کرید اس زمانہ کی نسبت کی جاتی۔ تو اَور بھی ثبوت اس امر کے ملتے۔ کہ ہونہار بروا کے پہلے ہی سے چکنے چکنے پات تھے۔ چونکہ مولانا نے اِس مقصد کو اتنا اہم نہیں سمجھا۔ جتنا کہ وُہ فی الواقع ہے۔ اِسی لئے اُنہیں پہلے باب میں سید احمد خاں کے خاندانی حالات اور ابتدائی سوانح مختصراً بیان کرنیکے بعد اس معذرت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وُہ لکھتے ہیں" سرسید کے خاندان کا حال جس قدر کہ ہم نے لکھا ہے شائد ناظرینِ کتاب اُس کو قدر ضرورت سے زیادہ خیال کریں۔ لیکن "بائیوگرفی"[1] کا اصل مقصد جو "ہیرو" کے اخلاق وعادات وخیالات کا دُنیا پر روشن کرنا ہے۔ وہ اسوقت تک پُورا نہیں ہوسکتا۔ جب تک یہ نہ دکھایا جائے کہ "ہیرو" میں اخلاق وعادات اور خیالات کہاں سے آئے" ہمارے خیال میں بجائے اس معذرت کے اِس سے بھی زیادہ تفصیل کی ضرورت تھی۔ جو کچھ سید احمد خاں آخر کار بن گئے اور جو مفید عام کاموں میں اُنہوں نے کارگزاریاں کیں اُنکا بیان اس شرح وبسط کے ساتھ اتنا ضروری نہ تھا۔ جتنا ابتدائی حالات زندگی کا۔ وُہ باتیں تو اب زمانہ جانتا ہے اور اِنہی کی وجہ سے سب کو جستجو ہے کہ دیکھیں۔ اس نمایاں زندگانی کی ابتدا کیسی تھی۔ اور اسی کے بیان میں سب سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوسکتی ہے۔ اور افسوس ہے۔ کہ ہمارے لائق مصنّف نے وہیں اختصار سے کام لیا۔

[1] بائیوگرفی۔ سوانح عمری۔ حالاتِ زندگی۔ حیات۔

بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک کے زمانے میں ضروری تفریق کرنے اور اُس کے مدارج ترتیب وار دکھانے کی اہمیت کا پُورا اندازہ نہ کرنے کے باعث ہی مولانا حالی ایک اَور باریک سی غلطی میں پڑے ہیں اور وُہ یہ کہ انہوں نے ابتدائی زندگی کے حالات لکھتے ہُوئے بھی سیّد احمد خاں مرحوم کو سرسیّد کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ دیباچہ چھوڑ کر اصل کتاب صفحہ ۱۵ سے شروع ہوتی ہے۔ اُس میں پہلے صفحہ پر تو بیشک یہ لکھا ہے کہ "سیّد احمد خاں ۱۷۔ اکتوبر سنہ ۱۸۱۷ء کو دلّی میں پیدا ہُوئے"۔ لیکن آگے چل کر اسی پہلے باب میں جا بجا انہیں سرسیّد۔ سرسیّد لکھا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا ہے۔ کہ بعض مقامات پر محض اس لفظی ہیر پھیر میں گویا ایک قسم کی تاریخی غلطی پیدا ہو گئی ہے۔ جو مذاقِ صحیح کو کھٹکتی ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۲ میں لکھا ہے: "سنہ ۱۸۴۵ء میں سرسیّد فتحپور سیکری سے جہاں وُہ خود منصف تھے۔ دلّی آئے"۔ مگر سنہ ۱۸۴۵ء میں "سرسیّد" کا وجود کہاں تھا۔ سیّد احمد خاں تو البتہ موجود تھے۔ مگر "سر" کا تو کسی کو خواب خیال بھی نہ تھا۔ یا صفحہ ۲۴ میں درج ہے: "سرسیّد کو اوّل حاتم علی خاں کی والدہ نے دودھ پلایا"۔ یا صفحہ ۲۵ میں "بچپن میں سرسیّد پر نہ تو ایسی قید تھی الخ"۔ یہ اور ایسی اَور عبارتیں ظاہر کرتی ہیں۔ کہ اس بات کا التزام نہیں کیا گیا۔ کہ سیّد احمد خاں کے بچپن اور جوانی کے بیان میں اور اُس بوڑھے سیّد احمد خاں کے بیان میں جو مسلمانوں کا مسلمہ سرگروہ اور خطاب "سر" سے مخاطب تھا۔ ایک صاف امتیازی لکیر رکھی جاوے۔ اور دونو کو ملا کر بے لُطفی نہ پیدا کیجائے۔ سوانح عُمری کیا ہوتی ہے۔ ایک سچّا ناول۔ لکھنے والے کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُس میں ناول کا سا مزا ہو۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہو۔ کیونکہ ناول ملمع ہے اور سوانح عُمری کی کتاب زرِ خالص۔ ناول میں بڑی خوبی یہی ہوتی ہے۔ کہ جوں جوں واقعات پیش آتے جاتے ہیں۔ اُس ترتیب کے ساتھ انکا تذکرہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایک شخص جو آخر عمر میں کسی سلطنت یا ریاست کے وزیر کے رُتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اُسے

پہلے ہی سے وزیر کے خطاب سے یاد کیا جائے۔ بلکہ اس خطاب کا نام بھی نہیں آتا۔ تاوقتیکہ اِس کا مناسب موقعہ نہ آجائے۔ بہت بہتر ہوتا۔ اگر صرف دیباچہ کو چھوڑ کر باقی کتاب میں سید احمد خاں کے نام کے ساتھ "سر" کا لفظ اُس وقت تک نہ آتا۔ جس وقت یہ خطاب انہیں عطا ہوا ہے اور محض اُس تاریخ کے بعد کے واقعات میں جب لفظ "سر" اُنکے نام کا جزو بن گیا۔ یہ نام کے ساتھ شامل کیا جاتا۔

حیات نویسی کے پہلو سے جہاں مولانا حالی کی کتاب پر مندرجہ بالا اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہیں اس خوبی کا اعتراف بھی کرنا واجب ہے کہ اُنہوں نے اس اصول کو کہ زندگی کے سب حالات جو معلوم ہوں من وعن کہدیئے جائیں اور کوئی کوشش بعض واقعات کو بڑھا کر دکھانے اور بعض پر پردہ ڈالنے کی نہ کیجائے۔ عمل کیا ہے۔ تاکہ لوگوں کو صحیح رائے قائم کرنیکا موقعہ ملے۔ مثلاً مولانا حالی نے سید احمد خاں کے ایام جوانی میں رنگین صحبتوں میں شریک ہونے کی جو روایتیں بیان کردی ہیں۔ اُن سے نہ صرف انتہائے حق پسندی بلکہ غیر معمولی آزاد خیالی کا ثبوت دیا ہے۔ اور یہ وُہ بات ہے جس کی جُرأت اس ملک کے سوانح نگاروں میں بہت کم کر سکتے۔ یہ روایتیں بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں :—

"اُس زمانہ میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دِلّی میں تھے۔ اُن کے گھر پر سبت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہنکر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا۔ جس میں حوض تھا۔ اس حوض میں زرد ہی پانی کے فوّارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اُس میں بھی زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ اور طوائف باری باری بیٹھکر گاتی تھیں۔ سرسیّد کہتے تھے کہ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اُس جلسہ میں شریک ہوتا تھا۔" ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے بیانات سے کوئی کمی اس وقت میں جو سیّد مرحوم کی لوگوں کے دلوں میں ہے نہیں آسکتی۔ بلکہ یہ اور قابلِ تعریف معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجُود ان شوقوں کے طبیعت میں موجود ہونے کے

جو اکثر لوگوں کو مشاغل ضروری سے غافل کر دیتے ہیں۔ وہ آخر اُن کے ایسے تارک ہوئے اور فرائض قومی کو اس طرح سرانجام کیا کہ دُنیا دنگ رہ گئی۔ مولانا حالی کا یہ لکھنا بالکل حق بجانب ہے کہ "سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا۔ وہ درحقیقت اُن کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جسکو اُن کی اخلاقی طاقت کا سب سے پہلا کرشمہ سمجھنا چاہئے۔ گویا یہ شعر اسوقت اُن کے حسبِ حال تھا ؎

ہزار دام سے نکلا ہُوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے"

سید احمد خاں کے حالاتِ مُلازمت اور ترقی مناصب۔ اُن کی مفید تالیفات اور اُن کی شہرت۔ اُن کے سرکاری اور غیر سرکاری اعزاز اور خطابات۔ اور اُن کی قومی خدمات کا بیان جس بسط معلومات کے ساتھ مولانا حالی نے کیا ہے۔ وہ اس کتاب کو بہت بیش قیمت بناتا ہے۔ اور یہ وہ مواد ہے۔ جس سے آئندہ زمانہ کا کوئی سوانح نگار جو سرسید کے حالات پر قلم اٹھائے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ کتاب کے اس حصہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ کچھ لکھیں۔ کیونکہ اس میں مولانا نے کچھ کسر نہیں چھوڑی۔ بلکہ اقتباسات میں جو علیگڈھ کالج اور تعلیمی کانفرنس وغیرہ کے متعلق مشاہیر کی تقریروں۔ یا اخباروں کے مضامین سے کئے گئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ اور اچھا ہوتا اگر یہ چھپی ہوئی تقریروں کی نقلیں کم جگہ لیتیں۔ اور ان کی جگہ کوئی دلچسپ خطوط خود سید احمد خاں کے لکھے ہوئے یا اور حالات جو دوسرے مقاموں پر چھپے ہوئے نہیں مل سکتے درج کئے جاتے۔ ہمیں اس بات کا ذاتی علم ہے کہ ملک میں سید احمد خاں کے بیشمار دوستوں کے پاس اب بھی اُن کے ایسے ایسے خطوط پڑے ہوئے ہیں۔ جن کا شائع کرنا بہت مفید ہو سکتا ہے اور جن کے پڑھنے سے اُن کی زندگی کے حالات پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔ ایسے حضرات کو چاہئے کہ اس کتاب کی طبع ثانی سے پہلے ایسی چیزیں یا ان کی

نقلیں مولانا حالی کی خدمت میں پہنچادیں - تاکہ وُہ ان کو کام میں لاسکیں اور ان اخباروں اور تقریروں کے انتخابات کو جو بارہا چھپ کر لوگوں کی نظروں سے گذر چکے ہیں - نکال کر زیادہ ضروری مطالب کے لئے جگہ پیدا کیجائے - کیونکہ دراصل ہمیں اِس سے بحث ہے کہ سید احمد خاں کون تھے اور کیا تھے - نہ اس سے کہ لوگ اُن کی تعریف میں کیا کیا عبارت آرائی کرتے تھے - اور اُن انتخابات میں جنکی طرف اشارہ کیا گیا ہے - زیادہ تر ایسی ہی عبارت آرائیاں ہیں -

مولانا حالی نے اس کتاب میں کہیں کہیں ناظرین پر سرسیّد مرحوم کی بڑائی کا اثر ڈالنے کی کوشش کی ہے - گو ایسا کرنا سوانح نگار کے لئے جائز ہے - لیکن زیادہ خوبی اس میں سمجھی جاتی ہے - کہ بڑائی کا نتیجہ ناظر کی طبیعت خود بخود نکالے - وہ خود بخود دیکھے کہ کس مُعاملے میں لوگوں نے ممدوحِ کتاب کی نسبت غلط رائے قائم کرکے اُس پر ظلم کیا - کس بارہ میں اُس نے سینہ زوری سے کام لیا اور لوگ حق پر تھے - کس بات میں وُہ زبردست تھا اور کس میں کمزور - خوبیاں اپنے ہمسروں سے بڑھ کر کہاں تک اُس کے حصہ میں آئی تھیں اور انسانی کمزوریوں میں سے کون کون سی اُس میں نمایاں تر تھیں - ایڈیٹر

(باقی دارد)

شریف - جناب حکیم محمد شریف صاحب (آئی ڈاکٹر) رئیسِ لاہور کی پروپرائیٹری اور جناب جالب دہلوی کی ایڈیٹری میں ایک نہایت عُمدہ نئے اخبار کے نکلنے کا اعلان کیا گیا ہے - حضرت جالب تجربہ کار ایڈیٹر اور مضمون نگار ہیں - خاکِ پاکِ دہلی سے جو نسبت انہیں ہے - وہ اس بات کی کافی ضمانت ہے - کہ اخبار "شریف" زبان کے اعتبار سے قابلِ قدر ہوگا - حکیم صاحب اس اخبار کے اجرا میں کھُلے دل سے روپیہ صرف کرنا چاہتے ہیں - جس سے اُمید ہوتی ہے - کہ یہ اخبار خوبیوں کا مجمُوعہ ہوگا - یہ لکھ چکنے کے بعد "شریف" کا پہلا پرچہ بھی نظر سے گذرا - بہت امید دلانیوالا ہے -

سرِّ دلبراں

مستِ مے بیدار گردد نیم شب
مستِ ساقی روزِ محشر بامداد

کچھ دنوں کا ذکر ہے کہ ایک خوش وقت ہمارے نصیب ہوا۔ ہمارے حالات میں چنداں تغیر نہ ہوا تھا۔ نہ ہمارے احباب کے حلقہ میں کوئی غیر معمولی تفاوت۔ نہ طبیعتوں میں کوئی مستثنےٰ قسم کا جوش یا اُمنگ تھی۔ نہ موسم کوئی پارسال سے زیادہ شگفتہ تھا۔ نہ زمین کوئی غیر معمولی سرسبز تھی اور نہ آسمان کوئی ہماری خواہش کے مطابق دورہ کرنے لگا تھا۔ نہ پھولوں میں کوئی نئی بو باس اور اعجوبہ رنگت تھی اور نہ بہار میں کوئی طرفہ تروتازگی اور شگفتگی تھی۔ مگر کچھ بات ضرور تھی کہ زندگی کا مزہ جیسا اسوقت تھا کبھی اتفاق حسنہ ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ یقیناً سب کو عمر بھر وہ سماں یاد رہیگا۔ ان ایام کا مذکور ہے کہ چند زندہ دل احباب نے مخزن کے لیئے مضمون نگاروں کی ایک انجمن قائم کرنی چاہی اور یہ قرار پایا کہ چونکہ آجکل ملک میں نقادوں کا زور اور مبصروں کا شور ہو رہا ہے۔ اس لئے جو مضمون کوئی ممبر تیار کرے وہ بھٹی سے نکل کر سیدھا انجمن میں پہنچے اور میر مجلس یا جلاس کونسل صاحب کی رائے کی آگ پر چرخ دیکر پرکھا جاوے اور باقاعدہ مسکوک اور مضروب ہوکر اڈیٹر مخزن کے پاس فی الفور بغرضِ اشاعت روانہ کر دیا جاوے۔ ناظرین قدرتی طور پر اس کمیٹی کے کارہائے نمایاں سننے کے مشتاق ہونگے۔ مگر وہ کمیٹی کوئی سر و یا اور رومانیا کے مقننوں کی تو تھی نہیں کہ حکمتِ عملی کے میدان میں یلغاریں کرے اور نہ روس کے نہلسٹوں کی تھی کہ ملکِ عدم کی فتوحات کا بیڑا اُٹھائے۔ یہ تو چند زندہ دل احباب کا مجمع تھا جو ہندوستان کے مختلف گوشوں سے محض اتفاق سے ایک وادیٔ مینو سواد کے ایک

گوشہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور علم دوستی کی مشترکہ رسّی سے بندھے ہُوئے ہونیکے سبب گاہے گاہے دِن بھر کے کام کاج اور مشاغل سے فارغ ہو کر ایک دُوسرے کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ اور دِل بہلاوے کے لئے یکجا جمع ہو جاتے تھے۔ اس زندہ دِلی کے متحدہ نتیجوں میں وُہ وطن اور ابنائے وطن کو بھی شریک کرنے چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ اس کی بہار چند روزہ تھی۔ اور یہ ہونہار کیاری بے پھُولے پھلے بے وقت مُرجھا گئی۔

مری تعمیر میں مضمر تھی اِک صُورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا تھا خُونِ گرم دہقاں کا

اس کی ابتدا ہمارے مشفق و مکرم جناب حاضر سے ہُوئی۔ جن کی شُہرت اور لیاقت کا ایک عالم شاہد ہے۔ یہ بڑے منکسر المزاج ہیں۔ چنانچہ تمام دیگر معزز عُہدوں پر اپنے دُوسرے احباب کو رکھا۔ اور خود نہایت انکسار سے بدقت تمام سکرٹری کی اہم ذمہ واری کا کام منظور کیا۔ اور دھڑلے کا ایک مضمون لکھ کر اہل جلسہ کے سامنے پیش کیا۔ آفرین اور مرحبا کے نعروں سے کمرہ گُونج اُٹھا اور واہ حضرت ... واہ حضرت ... کے شور سے کان بہرے ہو گئے۔ خیر جُوں تُوں کر کے یہ مضمون بغرضِ اشاعت روانہ ہُوا۔ مگر بدقسمتی سے راستہ میں گُم ہُوا۔ اور اپنی منزلِ مقصود پر نہ پہنچا۔ شائد اُس نے اچھوتے اور حجلہ نشین مضامین کی پردہ دری اور اشاعت کی بے حُرمتی گوارا نہ کی اور پردۂ ہستی سے روپوش ہو جانا مناسب سمجھا۔ کچھ ہی سہی مگر اس نونہال مجلس کے بے وقت گذر جانے سے اہل محفل کی ایسی کمر ٹوٹی کہ پھر کسی نے اس بات کے لئے قلم کبھی نہ اُٹھایا۔ ہاں زبانی شعر و سخن کے مشاعرہ اور تفریحی فی البدیہہ اجلاس بہت ہوتے رہے۔ جن میں بھی کچھ کم عجیب کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ ہر شخص کا تخلص حسبِ حال ہوتا تھا اور عموماً وہاں شعر و سخن بھی حسبِ حال ہی ہوتے تھے۔ ایک صاحب کاذب تھے کہ دروغ اور مبالغہ میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ ایسے ایسے زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے کہ اہلِ محفل دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مبالغہ

ہی ایک صفت شاعری کی ایسی ہے جو شاعری کو شاعری بناتی ہے۔ ورنہ شاعری کیا ہوتی۔ سخرہ پن ہوتا۔ بڑی بڑی دور از کار تشبیہات لاتے اور استعارات ڈھونڈھتے اور ایسے ایسے گول اور پیچدار اشعار میں اپنا ذرا سا مطلب بشرطیکہ مطلب ہوتا ادا کرتے کہ واہ وا اور تالیوں کے تو پخانوں میں ان کی آواز بھی گم ہو جاتی۔ اکثر تو اُنکا مطلب سمجھ میں بھی نہ آتا تھا۔ اور اصل بات یہ تھی کہ اس کے سمجھنے کی کوشش بھی کم ہی کی جاتی تھی۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ اس میں سوائے کوہ کندن اور کاہ برآوردن کے اور کچھ حاصل نہیں۔ ہاں صدائے تحسین و آفرین کا انعام تھا کہ سب کا حصہ انہیں کے حصہ میں آجاتا تھا۔ انکا ایک اصول تھا اور وہ یہ کہ کیسے ہی پیچدار اور مہمل اشعار کوئی لکھے ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ لوگ اُس کے مداح ہو جاتے ہیں اور اسکے کلام کی بیش بہا شرحیں لکھی جاتی ہیں اور ایسے ایسے معانی و مطالب کے نکات حل کئے جاتے ہیں کہ خود شاعر کے بھی وہم گمان میں نہ تھے۔ کاذب صاحب کی زندگی اسی امید کے بھروسے پر تھی۔ چنانچہ اپنے آپ کو بدر چاچی اور بیدل اور غالب سے کم نہیں سمجھتے تھے متقدمین کا نام بڑے فخر سے لیتے تھے۔ حالی اور اس کے ہم خیال لوگوں کے بڑے دشمن تھے اور انکے اشعار سُننا نہیں چاہتے تھے اور اُن پر سر ہلانا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ اِس لیئے احباب انکے چھیڑنے کے لئے اکثر کسی دوسرے شاعر کا نام لیکر حالی کے اشعار انکے گوش گذار کرتے رہتے تھے۔ مگر اصل حال کہنے پر انکی خفگی کی انتہا نہ رہتی تھی۔ مولانا کے اشعار میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا کرتے اور شعر بہت اچھا ہوتا تو کہدیتے کہ یہ حالی کا نہیں ہے۔

انہیں کے وزن پر دُوسرے صاحب جاذب نام تھے۔ وجہ تسمیہ تو معلوم نہیں۔ اتنا علم ہے کہ کتاب کے بڑے کیڑے تھے اور دن رات اسی دھن میں لگے رہتے تھے معلوم ہوا انکا ہاضمہ بہت تیز تھا جو کتاب کھاتے تھے ہضم ہو جاتی کیونکہ اجلاس میں انہوں نے کبھی کچھ نہ سُنایا۔ دُنیا کی کسی کتاب کا کسی زبان میں نام لیجئے انہوں نے ضرور پڑھی

تھی - پڑھی نہ تھی تو دیکھی تو ضرور تھی یہ معلوم نہیں کہ کسی فہرست کتب میں یا کسی بڑے کتب خانہ میں - یا کم از کم کسی دوست کی زبانی نام تو ضرور سنا تھا - جس کے یہ معنے کہ آپ اس کے مضامین اور مطالب سے بے بہرہ اور غافل نہیں ہیں - عام مشہور کتابوں کا تو کچھ حال نہ پوچھئے - سب کی ایک ایک دو دو سطریں حفظ یاد کر رکھی تھیں - عین موقعہ پر سُنا دیتے اور مدعی کو بھگا دیتے - دو صاحب پھکڑ اور جھکڑ تخلص کرتے تھے - پھکڑ کسی سے ڈرتے نہ تھے - وقت بے وقت ازالۂ حیثیتِ عرفی کرنے کے لئے تیار رہتے تھے کبھی لگی لپٹی نہ رکھتے تھے بڑوں بڑوں کے منہہ پر صاف صاف سُنا دیتے تھے - اُن کی رائے تھی - کہ خدا نے جو منہہ میں زبان دی ہے تو بولنے کے لئے دی ہے اس لئے جو دل میں آئے زبان پر لانا چاہیئے ورنہ انسان تیرہ باطنی کا مرتکب ہوتا ہے - جھکڑ صاحب میں سوائے اس کے کہ تعریفوں کے پُل باندھنے اور تالیوں کا طوفان بپا کرنے میں یکتا تھے - بظاہر کوئی خوبی نہ تھی - وہ اس کو توقیرِ اہلِ سخن اور دل بڑھانا سمجھتے تھے - اس غل غپاڑہ کے سبب ایک روز پھکڑ صاحب نے انکو جھکڑ کے معزز خطاب سے یاد کیا - شاید انکو تخلص کی تلاش تھی - اس پر ایسے خوش ہوئے کہ اُسی دن سے اختیار کر لیا - اُن کے علاوہ اور بھی احباب تھے - شاطر بروزن خاطر - قاصر بروزن ناصر - خالی بروزن حالی - بعد میں خبطی - ضبطی - بصیر - غرّیر - سقیم - جحیم - نحیف اور حنیف جا لے کیا کیا آکر شامل ہو گئے - اُن میں اچھے اچھے نثار بھی تھے - بعض تو شاعروں کو کبھی داد نہ دیتے اور ممکن ہوتا تو نوخیز شعرا کو نصیحت کرتے کہ اس کارِ مذموم کو چھوڑ دینا چاہیئے - اور شعر سُنتے وقت ایک پتھر کی طرح جس میں کوئی دلی جذبہ نہیں ہوتا بنے بیٹھے رہتے - مگر بعض بڑے غور کے ساتھ سُنتے اور آخر میں یا موقعہ پر ایک ہی لفظ سے حقِ داد ادا کر دیتے اور اس طرح سے ایک قسم کی تلافی ہو جاتی -

کسی کو سائنس کا اسقدر شوق تھا کہ وہی سر کو ٹکر دینے کے بیتے پاؤں کے نیچے رکھکر

غُسل کرتے۔ کپڑے نان کن ڈکٹڈ ہوتے ہیں اور فرش کی نمی اور سردی کا اثر نہیں پہنچنے دیتے۔ اور اس بات پر گھنٹوں بحث کرتے۔ کسی کو نثر کا انداز ایسا پسند تھا کہ جس شخص کو چٹھی لکھتے وُہ سمجھتا کہ زیادؔ و حلادہ کا ایک باب کاٹ کر بھیجدیا ہے۔ کوئی آزاد کا مداح تھا اور ہر وقت اس خیال میں رہتا تھا کہ کوئی کسی طرح کہہ دے کہ تمہارا فلاں فقرہ آزاد کے ڈھنگ کا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی فارسی تحریر کا گرویدہ کوئی انگریزی طرز کا دلدادہ تھا۔ غرض ہر گُلّے را رنگ و بُوئے دیگر است کا مضمون تھا۔

اوّل اوّل تو یہ تجویز تھی کہ تمام ممبروں کے تخلّص فاعل کے وزن پر ہیں مگر جب حلقہ وسیع ہوا تو ہر قسم کے تخلّص اختیار کئے جانے لگے۔ چنانچہ ایک صاحب بھونچال بروزن خلخال اور دوسرے بانہال بروزن اقسقال تخلّص کرتے ہیں۔ ہم بڑی خوشی سے ان اصحاب کا نمونہ کلام درج کرتے مگر اوّل تو یہ جناب جاؔفر صاحب کا علاقہ ہے اور اس میں قدم رکھنے سے ہم کو مداخلتِ بیجا اور غصب کے ملزم ٹھہرنے کا خوف ہے۔ دوم ہمیں اُمید ہے کہ یہ اصحاب اپنے اپنے اچھوتے کلام سے ان اوراق کو خود بخود مع اپنے معزز تخلّصوں کے رونق بخشینگے۔ اِس لئے ہم اسوقت انکا ترجمان ہونیکی کوئی ضرورت نہیں دیکھتے۔ ہزاروں کڑوی مگر سچی۔ بیہودہ مگر مزے کی۔ تلخ مگر کہنے کی باتیں ہیں کہ کوئی ذمہ دار آدمی اپنے نام کے ساتھ منسوب کر کے کھُلم کھُلا انکو قیدِ تحریر میں لانیکی جرأت نہیں کرسکتا اور اگر کرے تو حق یہ ہے کہ سارا لطف اور مزا خاک میں مل جاتا ہے۔ اِس لئے ان حروف کے راقم کو اُس پُرانی محفل کے اُن معزز اور محترم ممبروں سے جنکی نظر سے ضرور ہے کہ یہ سطور گذریں۔ یہ اُمید ہے کہ وہ اس قابلِ توجہ امر پر اپنی بہترین توجہ مبذول فرما کر گمنام مگر اچھوتے نتیجہ خیز اور چلبلے مضامین کا ایک تانتا باندھ دینگے اور اِس ہرزہ گوئی کو زی تمہید نہ رہنے دینگے۔ ہ

تا درختِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

مُہوس

انگریزی شاعری کا ایک ورق

"لونگ فیلو - امریکہ میں ایک فصیح البیان شاعر گذرا ہے اس پر اہل امریکہ کو ناز ہے - انگلستان کے لوگ تمام شعرائے امریکہ پر اسکو ترجیح دیتے ہیں - اور اسی کے کلام کو زیادہ پسند کرتے ہیں ناظم جادو نگار قلم سے نیچر کی تصویریں بے مثل اُتارتا ہے اور نگاہ کے سامنے انہیں رنگوں میں پیش کر دیتا ہے - اس کی نظم میں شستگی اور اثر خیزی بہت ہے - ۱۸۴۷ء میں اس نے "ایونجیلن" ایک مشہور نظم لکھی تھی جو بیحد مقبول ہوئی اور منجملہ اور نظموں کے یہ بہت ہی گرانمایہ سمجھی جاتی ہے - آمد آمدِ موسم سرما کو کس دلربا عنوان سے بیان کرتا ہے کہ اس کے مقابل کی کوئی دُوسری تصویر نہیں دکھائی دیتی - سچ تو یہ ہے کہ جو اس سادگی میں لطف ہو وُہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں اور مبالغہ میں نہیں" - (مترجم)

اکیڈی میں موسمِ خزاں اور سرما کا آغاز

اب وُہ فصل آپہنچی جسکی راتیں ٹھنڈی اور بڑی ہوتی ہیں اور پیچھے ہٹنے والا آفتاب بُرجِ عقرب میں داخل ہوتا ہے - خانہ بدوش طائر برف آلود خلیج شمالی چھوڑ کر مرطوب ہوا میں اُڑ کر گرم جزیروں کے کنارے جا پہنچے ہیں - غلہ کٹ کر کھلیان میں جمع ہے - جنگل کے درخت ستمبر کی تیز ہوا سے تندی کے ساتھ کشتیاں لڑ رہے ہیں - جس طرح کہ اگلے زمانہ میں حضرت یعقوب فرشتہ کے ساتھ لڑے تھے - آثار سے نمایاں تھا کہ اب کے جاڑا شدت کا پڑے گا - اور بہت دنوں تک رہیگا - مکھیوں نے اپنی دُور اندیش عقل سے جس نے سکھا دیا تھا کہ جاڑوں میں خوراک مشکل سے ملتی ہو اسقدر شہد جمع کر رکھا تھا کہ اُنکے چھتے اُبل پڑے تھے - جنگلی شکاریوں کا یہ قول تھا کہ قیامت کی سردی پڑیگی کیونکہ لومڑیوں کے جسم کے بال گھنے اور بڑے

ہو چلے تھے - غرض فصل خزاں کی یہ کیفیت تھی -

اب اس کے بعد وہ پیارا اور خوشگوار موسم آیا جسے اکیڈیا کے مقدس گنوار "سمر آف ال سنیٹس" کہتے ہیں - اسوقت ایک ہلکی اور فریفتہ کرنے والی روشنی ہوا میں پھیلی ہوئی تھی - اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے منظر ابھی پیدا ہوا ہے اور بچہ کی طرح پیارا نظر آتا تھا - سارے عالم میں ایک سناٹا تھا اور سمندر کا بے چین دل بھی اسوقت ٹھہرا ہوا تھا - تمام آوازیں مگر ایک سُریلی آواز ہو گئی تھی - کھیل کود میں بچوں کی صدائیں - کاشتکاروں کے جھونپڑوں میں مرغ کا بولنا - دھیمی ہوا میں چکر لگاتے وقت طائروں کا پھٹ پھٹانا اور کبوتروں کا غوں غوں کرنا - یہ سب آوازیں محبت کی سرگوشیوں کی طرح آہستہ اور دبی ہوئی تھیں - بڑا آفتاب اُن سُنہرے بادلوں میں سے جو اُسے گھیرے ہوئے تھے دُنیا کو اُلفت کی نظر سے دیکھ رہا تھا جبکہ صحرا کا ہر رونق دار درخت (سُرخ - بھورے - گلنار اور زرد رنگ کی پوشاکیں پہنے - اُن پر شبنم کے قطرے چمکتے - جس کی تمثیل درخت کی طرح شاخیں تھیں اور جسے شاہِ ایران نے قیمتی کپڑوں اور جواہرات سے آراستہ کیا تھا) اپنی بہار دکھا رہا تھا -

اب عیش - اختلاط اور سناٹے [سلہ] کا زمانہ آگیا - دِن اپنی محنت کے بوجھ اور گرمی کی تکلیفوں کے ساتھ رخصت ہوا - شفق کھلی اور اُس کے ساتھ شام کا ستارہ پھر آسمان پر چمکا - بیلوں کے گلّے پنجوں سے مٹّی کریدتے - ایک دوسرے پر گردن ڈالے - نتھنے پھیلائے شام کی تازہ ہوا پیتے - گوسالہ کو واپس آئے - انکے آگے آگے ایونجیلن کی خوبصورت گائے جس کے گلے میں گھنٹی پڑی ہوئی - جسے اپنے سفید چمڑے اور ریشمی فیتے پر بڑا ناز تھا جو اُس کے گلے میں بندھا اور ہوا سے اُڑتا جاتا تھا - آہستہ آہستہ جارہی تھی - گویا وہ اِنسانی محبت سے باخبر تھی - پھر گڈریا - ہنہناتی بھیڑوں کو سمندر کی طرف سے لیکر آیا - جہاں وہ شوق سے چرا کرتی تھیں - اُنکے پیچھے پیچھے - صابر - پاسبان کتا اپنے منصب سے خبردار - جسے

سلہ جاڑوں کی شام سے مراد ہے ۱۲

اپنی سمجھ پر غرہ تھا۔ بڑی شان کے ساتھ ادھر سے اُدھر جاتا۔ غرور کے ساتھ اپنی دُم ہلاتا اور جو بھیڑیں پیچھے رہجاتیں انکو ہنکا کر آگے لے آتا تھا۔

رات کو جب گڈریا سو جاتا اور سناٹے۔ تاروں بھری رات میں جنگل کے بھیڑیے غُل مچاتے تو وُہ اُن گلّوں کا مالک بنتا اور نگہبانی کرتا تھا۔ چاندنی کھیت کرنے کے بڑی دیر کے بعد بھیگی زمینوں سے سُوکھی گھانس کی گاڑیاں لوٹیں۔ ان پر خشک۔ نمکین گھانس لدی ہوئی جنگلی خوشبو ہوا میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھوڑوں کے یالوں اور بالوں پر شبنم پڑی ہوئی تھی اور وُہ خوشی میں ہنہناتے[ف۱] جاتے تھے۔ اُنکی پیٹھ پر کاٹھ کی وزنی زین۔ خوبصورت رنگوں سے رنگے ہوئے اور قرمزی رنگ کے پھندنوں سے آراستہ۔ ایک خوبصورت قطار میں اِس طرح ہلتے جاتے تھے جیسے گل خیرو کے درخت پھولوں کے بوجھ سے بار بار جھکتے اور اُٹھتے ہیں۔

اِس اثنا میں گابھن جھکی کھڑی گوالنوں سے اپنا دودھ دھوا رہی تھیں۔ اور پھین اُٹھاتی ہوئی دُودھ کی دھاریں جب اُس کے برتن میں گرتی تھیں تو اُنکی خوش آیند آواز سے وُہ برتن بھی سُر دینے لگتا تھا۔ چارپایوں کی صدائیں اور قہقہے کی آوازیں برابر کھیت میں سُنائی دیتی تھیں۔ جنکو غلّہ خانے لے اُڑتے تھے۔ فوراً یہ صدائیں بھی موقوف ہو گئیں۔ غلّہ خانے کے دروازے بند کئے گئے۔ جن سے چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ تلی جو لگائی گئی تو کھڑکھڑاہٹ کی صدا آئی۔ اب تھوڑی دیر کے لئے تمام سناٹا چھا گیا۔ کسان (ایونجیلین کا باپ) چین سے اپنی آرام کرسی پر مکان میں بیٹھا چوڑے مُنہہ کے آتش خانہ کی آگ سے گرمایا دیکھ رہا ہے کہ شعلے اور دھوئیں کے بونڈلے دشمنوں[ف۲] کی طرح ایک جلتے ہوئے شہر میں کیونکر آپس میں لڑ رہے ہیں

ف۱ تھان پر پہنچنے کی خوشی ۱۲

ف۲ شاعر نے کیا اعلیٰ درجہ کا مضمون پیدا کیا ہے۔ اُسکا مقصود یہ ہے کہ جب آگ سُلگ جاتی ہے تو دُھواں جاتا رہتا ہے اور جب آگ بجھ جاتی یا دھیمی ہو جاتی ہے تو پھر دُھواں زیادہ ہو جاتا ہے۔ اِس طرح ایک دوسرے پر غالب آجاتا ہے ۱۲

پیچھے دیوار پر کسان کی پرچھائیں گھٹتی بڑھتی۔ اُسکا مُنھ چڑھاتی۔ عجب عجب رنگ کی خیالی صورتیں پیدا کرتی اور پھر تاریکی میں غائب ہوجاتی ہے۔ آرام کُرسی کی پُشت کی لکڑی بالوُت کی تھی جس میں بھونڈی بھونڈی صورتیں منقش تھیں وہ جھلملاتی روشنی میں ہنس رہی تھیں۔ جست کی پلیٹیں جو میز پر چُنی ہُوئی تھیں۔ جب اُن پر اُسی آگ کے شعلوں کی روشنی پڑتی تھی تو وہ اس طرح چمک جاتی تھیں۔ جس طرح رسالوں میں ڈھالیں چمکتی ہیں۔

بڑھا بڑے دن کی مناجاتیں اور اِدھر اُدھر کے پُرانے دقیانوسی گیت گایا کرتا تھا جس طرح کہ اگلے زمانہ میں اُس کے بزرگ نارمنڈی اور برگنڈی کے انگور کے روشن باغوں میں گایا کرتے تھے۔ بھولی ایونجیلین اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی اُس کپڑا بُننے والی کل کے لئے (جو اُس کے پُشت والے کمرہ کے ایک گوشہ میں رکھی ہُوئی تھی) اُس چرخہ میں جس میں سن کا سُوت کاتا جاتا ہے۔ کات رہی تھی۔ کل کے اُس حصّہ کی آواز جو پاؤں کے اشارہ سے چلنے لگتا ہے بالکل بند تھی۔ چلتی پھرتی دُھرکی بھی خاموش تھی۔ مگر چرخہ کی یکساں دھیمی آواز جو بانسری کی سُست آواز سے مشابہ تھی۔ اِس بڑھے کے گانے کی صدا سے مِل جُل کر ایک ہوگئی تھی۔ جس طرح گرجے میں گانیوالوں کے نغمے تھوڑی دیر کے بعد موقوف ہوجاتے ہیں تو اُسوقت اُس کے اندر کے راستہ سے جو لوگوں کے پاؤں کی آہٹ اور پادری کی آواز اونچی منبر سے سُنائی دیتی ہے۔ اِسی طرح گانے کے ہر ٹھہراؤ کے ساتھ ہی گھڑی کی کھٹا کھٹ کی آواز برابر سُنائی دیتی تھی ✚

علی سجّاد دہلوی (از عظیم آباد)

ہمارا معشوق

اور معشوق بھی وُہ جسکی چاہ کا حضرات تلامیذ الرحمٰن دم بھرتے ہیں! جسکی ایک ایک ادا انکے تبر و تیر و خنجر و شمشیر کا کام دیتی ہے۔ جس کے عُنابِ لب انکی تپ فراق کا حکمی علاج ہیں۔ جنکا شربتِ دیدار انکے لئے آبِ حیات سے کم نہیں۔ جسکی چشمِ شہلا سے انکی آنکھوں میں نُور آتا ہے۔ جسکی ذرا سی کج ادائی سے یہ غریب جان بحق تسلیم ہوتے ہیں۔ جس کی ایک ٹھوکر سے انکی بوسیدہ ہڈیاں (جو اسی آرزو میں خاک ہو گئی ہیں) اِنا اللہ کہتی اپنی اصلی حالت میں سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ جس کے ہجر میں ان بدنصیبوں کو تڑپتے ہی گذرتی ہے۔ غرض ان کی جان۔ انکے ایمان۔ انکے دِل۔ انکے دماغ۔ اور انکے قضا و قدر کا مالک۔ یا دُوسرے لفظوں میں یُوں کہئے۔ کہ جو ان کا حاصلِ عُمر ہوتا ہے۔ جس کے حُسنِ گلوسوز۔ جس کے وہمی وعدوں اور ذہنی دم دھاگوں نے بیچارے دامِ محبت کے نو گرفتاروں کو رات نہیں بلکہ عُمر عُمر بھر بے چین اور بے قرار رکھا۔ جس کے خواہ مخواہ کے تصور نے غریب موذن کو بے نُقط سنوائیں۔ جس کے انتظارِ بے بُنیاد نے مُرغِ سحر خیز سے لیکر خروسِ عرش تک پر چھُریاں تیز کرائیں۔ زاہدِ شب زندہ دار کو صلواتیں سُنوائیں۔ مُلا پر آوازے کسوائے۔ شیخ پر پھبتیاں کھلوائیں۔ جس کافر نے مسلمانوں سے ترکِ اسلام کرایا۔ تسبیح کی جگہ زُنار اور گھنٹے کی بجائے قشقہ کھچوایا۔ اور جس کے ہرجائی ہونے کی بدگمانی نے۔ عمرو۔ بکر۔ زید۔ خالد۔ الک۔ ٹھک اور خُدا جانے کِس کِس کو حریفِ بدخواہ اور رقیبِ روسیاہ تسلیم کرایا۔ جو معاملہ کا ایسا بُرا کہ جس کو دیکھا گالیاں دیتے۔ جس کو سُنا صلواتیں سُناتے۔ اسی پر بس نہیں۔ دُنیا بھر کا کونسا عیب ہے جو اس میں موجود نہیں۔ بہمہ عیوب معیوب۔ کافر۔ بدکیش۔ جفاجو۔ ستم شعار۔ سنگ

بدزبان - بدعہد - بدمعاملہ - بدخُلق - جلّاد - ستمگر - عیّار - وغیرہ وغیرہ -

صُورت شکل کا کیسا ہے ؟ ایک صاحب فرماتے ہیں - کہ وُہ پری جمال - سرو قد - شیریں حرکات آہو چشم - ماہ سیما - دوشیزہ - اسقدر نازک ہے - کہ ایک پھُول کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتی -

دُوسرے بزرگوار ہانک لگاتے ہیں - کہ وہ ملاحت کی کان - نزاکت کی جان - بالکل دھان پان - صراحی دار گردن - پھُول کی پتی سے ہونٹھ - ایسی نازک ہے کہ اگر (خدانخواستہ) آپ کو اس کے بوسہ کا کبھی خیال بھی آجائے - تو معاً گال نیلے ہو جائیں (جھوٹے کی .....) جس سے ثابت ہوا کہ وُہ ایک ناکارآمد اور بالکل بے مصرف شے ہے -

ایک اَور صاحب پتہ دیتے ہیں کہ باوجُود بے حد شوخی و رعنائی قیامت نما - حُسنِ صورت و تناسبِ اعضا کے کمر نہیں رکھتا ! یعنی ایک حُسن کا پتلا ایسے طریق پر بنایا گیا ہے - کہ اُس میں کمر کا جُزو رکھا ہی نہیں گیا - اُہو ہو ! کیا کہنا ہے اس خوبی اور مناسبتِ اعضا کا - صاحب تب تو بدر منیر ہی نہیں بلکہ بے نظیر بھی ہے !! ؎

بال بھی بال سے باریک بھی معدوم بھی ہے
کیسا کمر ہے کمرِ یار کی ایسی تیسی

کوئی کہتا ہے کہ چوٹی نہیں بلکہ چوٹی سے ایڑی تک سیمنٹ کا پُشتہ لگا ہوا ہے -

دُوسرا بول اُٹھتا ہے - کہ زُلفیں نہیں بلکہ دو سانپ ہیں کہ اس ضحّاک صفت کے شانوں پر بَل مار رہے ہیں - غرض کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ - اب ذرا حُلیہ مُلاحظہ ہو :-

(۱) قد - لمبا اور اتنا لمبا کہ قُطب صاحب کی لاٹ کی گیلری کو بوسہ دے - اس پر ہاتھ پاؤں ایسے ہلکے پُھلکے اور نازک نازک کہ دیکھ کر خود اسی کو شرم آئے :-

(۲) سر کے بال اتنے لمبے اور گھنے کہ قدم قدم پر زمین بوسی کریں (بالکل دبال جان) -

(۳) پیشانی کا پتہ نہیں (کیونکہ غزلوں میں اسکا ذکر اسقدر کم کیا گیا ہے - کہ گویا بالکل نہیں کیا گیا) -

(۴) بھویں - دو سیاہ رنگ کی مچھلیاں جن سے اِنسان کو خواہ مخواہ ڈر معلوم ہو -

(۵) پلکیں - ایک خونخوار فوج کا دستہ سنگینیں لئے پہرا جمائے کھڑا ہے - معقول

(۶) آنکھیں - آدمی کے چہرے میں اُس کی اپنی آنکھوں کی بجائے - نرگس کا پھول یا ہرن کی آنکھیں - جیسی کچھ بھلی معلوم ہو سکتی ہیں - ویسی ہی خوبصورت یہ ہیں -

(۷) ناک - نذارد - کیونکہ اُس کا ذکر غزلیات میں بہت ہی کم پایا جاتا ہے -

(۸) گال - "یک جا جمع گشتہ آب و آتش" بالکل سفید جھوٹ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا - ضِدّانِ لَا یَجتَمِعَانِ - اگر گلاب کا پھول کہا جائے - تو رخسار کی ضرورت پھر باقی رہتی ہے -

(۹) لب - بے شُبہ برگِ گُل - جن سے نہ تو بات چیت ہو سکے - نہ کسی دُوسرے مطلب کے ! -

(۱۰) مُنہہ - نُقطۂ موہُوم - برائے نام - اور اِس قدر تنگ کہ لفظِ "وفا" کا تلفظ نہ کر سکے -

(۱۱) گردن - لمبی صراحی کی سی - تشبیہِ اعلےٰ بہ ادنےٰ - تاکیدُ الذم بما شبہ المدح -

(۱۲) شانے اور بانہیں اس کے غیر متناسب -

(۱۳) آگے چلئے - درختِ سرو پر دو ناشپاتیاں - یا نگترے یا اِسی قسم کا کوئی اَور پھل - کہیں لگ سکتا ہے ؟ ہے نہ قانونِ قدرت کے برخلاف ؟

(۱۴) کمر - "کہاں ہے ؟ کس طرف ہے ؟ اور کدھر ہے" ؟ ہائیں ! کیا کمر ہے ہی نہیں ! تو چھاتی میں ٹانگیں لگی ہُوئی ہیں کیا ؟ باقی حصۂ جسم کا پتہ نہیں -

باطن وُہ اور ظاہر یہ ! لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ - معشوق کا ہیکو یُوں کہئے کہ یہ تو اچھا خاصہ ہوّا ہے -

اوّل اوّل کسی غریب نے ایسے معشوق کا بیان کر دیا تھا - جو انتہا کا حسین تھا - مگر بدخُو بھی پرلے درجے کا تھا - مقلّدوں نے سمجھا سب کا محبوب ایسا ہوتا ہوگا - سُبحان اللہ نقل بنے بھی تو ایسے متعصب کہ سوائے بدباطن حسین کی نقل کے اور کوئی نقل بھاتی ہی

نہیں - بھئی آخر حسین خوش سیر بھی تو ہوتے ہیں - اُنہوں نے کیا گناہ کیا - کیا بدخوئی ہی میں لعل ٹکے ہیں - اور خوش خوئی کوئی صفت ہی نہیں - راوی اور ناقل بنے ہو - تو معقول بنو - نہیں تو بھونڈا مذاق باندھ کر رکھ لو - ہَوا نہ لگنے دو - اور اگر ناقل نہیں ہو اور جو کچھ بیان ہے - وُہ آپ بیتی کا ذکر ہے - تو خُدا تم سب پر رحم کرے - اور تمہیں اِس عذابِ الیم سے نجات دے ! ایں دُعا از من واز جُملہ جہاں آمین باد +

سیّد علمدار حسین بنوڑی

لالہ سری رام صاحب ایم - اے - جنکی تصویر آج زیبِ ورقِ اوّل ہی - مخزن کے اوّلین مضمون نگاروں میں ہیں - جن سے ہمیں وقتاً فوقتاً بہت معقول امداد ملتی رہی ہے - کچھ عرصہ سے بوجہ ناسازیٔ طبیعت اُنکے اَن تھک قلم کو مجبور سستانا پڑا ہی - جسکا ہمیں افسوس ہی - ورنہ انکے اوقاتِ فرصت کا بیشتر حصّہ اردو علم ادب کی خدمت میں گذرتا ہی - یہ شوق زمانہ طالبعلمی سے انکا رفیق ہی - اور دِن بدن بڑھتا رہا ہی - جسکا نتیجہ ایک ضخیم تذکرہ شعرائے اُردو ہے - جس کی چار بڑی بڑی جلدیں تیار ہیں - اور جس میں سوا سو سے زیادہ باکمال سخنوروں کا کلام ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کیا گیا ہے - جن میں سے بعض بالکل گنجِ گمنامی میں پڑے ہُوئے تھے - ان کے کلام کے چیدہ نمونوں کو یکجا کرنے میں بہت محنت سے کام لیا گیا ہے - اس کام کے علاوہ تاریخی مضامین سے صاحب موصوف کو خاص دلچسپی ہے اور علم دوست ہونا تو ان کا خاندانی ورثہ ہے - انکے والد ماجد آنریبل رائے بہادر مدن گوپال ایم - اے - بیرسٹرایٹ لا - اہل علم کے مربّی ہیں اور صاحب آنریبل موصوف کے بڑے بھائی رائے بہادر پیارے لال پنشنر انسپکٹر مدارس تو گویا اپنی عمر ہی تعلیم و تعلّم کی نذر کر چکے ہیں +

اُردو زبان پنجاب میں

عنوان مندرجہ بالا سے گو یہ مفہوم ہو سکتا ہے۔ کہ اس مضمون میں پنجاب اور ہندوستان کی اُردو کے متعلق ایسی بحث ہو جسے ہم ناگوار کہہ چکے ہیں اور جس سے ہم گریز کرنا پسند کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ نہیں۔ اس میں بعض محاوراتِ زبان کے متعلق اساتذہ کے کلام سے استناد کر کے جتایا گیا ہے۔ کہ ان کا کس کس طرح استعمال جائز ہے۔ اور انکے استعمال پر جو اعتراضات ہوئے تھے۔ اُن اعتراضات سے برئیت کی کوشش کی گئی ہے۔ جس تحقیق سے شیخ محمد اقبال صاحب نے اس مضمون میں کام لیا ہے وُہ قابلِ داد ہے۔ اور اسے اس بحث کا خاتم سمجھنا چاہئے۔

آج کل بعض اخباروں اور رسالوں میں اہل پنجاب کی اُردو پر بڑی لے دے ہو رہی ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس بحث کے فریق زیادہ تر ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اُدھر ایک صاحب "تنقید ہم درد" جو اخلاقی جرأت کی کمی یا کسی نامعلوم مصلحت کے خیال سے اپنے نام کو اس نام کی نقاب میں پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ناظرِ اقبال کے اشعار پر اعتراض کرتے ہوئے پنجابیوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ اِدھر ہمارے معزز و محترم دوست میر ممتاز علی ایڈیٹر "تالیف و اشاعت" اور انبالوی صاحب اپنے محققانہ مضامین سے اپنی وسعتِ خیال کا ثبوت دیتے ہیں۔ ہمارے دوست "تنقید ہم درد" اس بات پر مُصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اُردو کے مروّج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کی معیار کیا ہے۔ جو زبان بہمہ وجُوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو۔ اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کی معیار خود بخود قائم ہو جاتی ہے۔ لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پُورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اختراع کئے جا رہے ہوں اس کے محاورات

وغیرہ کی صحت وعدم صحت کی معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ اردو زبان جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا۔ اسواسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگین ہو جائے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اسکا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ان کے تمدنی حالات اور انکا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز کمرہ کچہری نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلا تکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پُر معنے پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اسکو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو! اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنے پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے! یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے اور جسکا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرے تو آپ کا عذر بیجا ہوگا۔ اردو ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے جس سے انگریزی نے کئی ایک الفاظ بدمعاش بازار لوٹ چالان وغیرہ لئے ہیں اور ابھی روز بروز لے رہی ہے۔

یہ ایک دلچسپ اور نتیجہ خیز بحث ہے جس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے مگر اس مضمون کا مقصد صرف ان اعتراضات کا جواب دینا ہے "جو تنقید ہم درد" صاحب نے میرے اور ناظر کے اشعار پر کئے ہیں۔ میں نے یہ جواب اس وجہ سے نہیں لکھا کہ

صاحب تنقید نے میرے یا میرے دوست حضرت ناظر کے کلام کو اپنی نکتہ چینی کا آماجگاہ بنایا ہے بلکہ میری غرض صرف یہی ہے کہ ایک منصف مزاج پنجابی کی حیثیت سے ان غلطیوں کا ازالہ کروں جو عدم تحقیق کی وجہ سے اہل پنجاب کی اُردو کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ اگرچہ تنقید ہم در "صاحب نے بالخصوص حضرتِ ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کئے ہیں مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے احتراز کرونگا کیونکہ فنِ تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو۔ تنقید کی بنا دوستی۔ محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہیئے۔ نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں ازراہ دوستی لکھیں اور طرزِ بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے۔ میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں :-

مے مخور چندانکہ نشناسد ز گل گلچیں ترا
پاسبانِ حسنِ پاکِ خویشتن بودن خوش است

حضرت ناظر کے کلام پر جو اعتراضِ تنقید ہمدرد "صاحب نے کئے ہیں اُنکا جواب انبالوی صاحب نے شافی طور پر دیدیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جواب دینے کا حق ادا کیا ہے۔ البتہ لفظ "سودا" کے غیر متغیر ہونے کی نسبت جو اُنہوں نے ارقام فرمایا ہے وُہ شافی نہیں ہے۔ اصولِ نحو کے رُو سے عربی الفاظ جن کے آخر میں الف ہو غیر متغیر ہیں مثلاً صحرا مینا وغیرہ مگر "سودا" میں اختلاف ہے۔ فصحائے دہلی میں سے مومن مرحوم اور فصحائے لکھنؤ میں سے آتش مرحوم کے کلام میں یہ لفظ متغیر اور ناسخ مغفور کے کلام میں غیر متغیر ہے۔ اگر حضرت ناظر نے اس لفظ کو غیر متغیر لکھدیا تو کیا بُرا کیا اور میری رائے میں سودا بمعنے جنون کو غیر متغیر ہی لکھنا چاہیئے تاکہ سودا بمعنے معاملہ بیوپار سے اس کی تمیز ہو سکے۔ میرے اشعار پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان میں سے الفاظ "چلمن کی جھلک" پر بھی ایک اعتراض ہے تنقید ہمدرد "صاحب میرے مقصود فی الذہن کو سمجھتے بھی ہیں اور پھر فرماتے ہیں کہ الفاظ سے

یہ مطلب نہیں نکلتا۔ بھلا اگر الفاظ میرے مقصود کے اظہار سے قاصر ہیں تو آپ نے میرا مطلب کیونکر سمجھ لیا؟ بہر حال انبالوی صاحب نے مرزا داغ دام فیضہ کا ایک شعر سند میں دیدیا ہے۔ جس میں بعینہ یہی الفاظ انہیں معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں جو میرے ذہن میں تھے۔ علیٰ ہذا القیاس انبالوی صاحب نے "مالا" کی تانیث بھی مفید الشعرا مصنفہ حضرت جلال لکھنوی کے حوالے سے ثابت کر دی ہے۔ اب بھی اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو مولوی سید احمد صاحب سلمہ کی فرہنگ آصفیہ ملاحظہ فرمائیے۔ باقی اعتراضات کا جواب بالترتیب عرض کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ "تنقید ہمدرد" صاحب انصاف کر کے اپنی غلطی کو تسلیم کرینگے۔

اعتراض اوّل۔ آرزو یاس کو یہ کہتی ہو + اک مٹے شہر کا نشاں ہوں میں

"تنقید ہمدرد" صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "آرزو یاس سے یہ کہتی ہے" ہونا چاہیئے۔ کاش ان کو اساتذۂ اُردو کے کلام پر عبور ہوتا یا کم از کم اس قسم کا نازک اعتراض کرنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لیتے۔ اکابر شعرائے قدیم و حال کا کلام اس دعوےٰ کا مؤید ہے کہ "کہنا" کا صلہ "سے" بھی آتا ہے اور "کو" بھی۔ البتہ ایک باریک فرق ان کے استعمال میں ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں "کہنے" کا مقولہ ایک کلمہ مفرد یا مرکب ناقص (ترکیب اضافی یا توصیفی وغیرہ) ہو اور اس میں مفعولِ اوّل کی کوئی صفت پائی جائے تو ہمیشہ "کو" آئیگا۔ مثلاً زید نے عمر کو جاہل کہا یا "بجز جام جہاں میں کہتے پیمانے کو کیا کہتے"۔ مگر جہاں مقولہ مرکب ناقص یا کلمہ مفرد بھی ہو لیکن وہ مفعولِ اوّل کی صفت پر دال نہ ہو اور نیز جہاں مقولہ ایک جملہ یعنے مرکب تام ہو تو "کہنا" کا صلہ "سے" اور "کو" دونوں آتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعر میں "کہنا" کا مقولہ مرکب تام یعنے "اک مٹے شہر کا نشاں ہوں" ہے۔ آپ کا ادعا ہے کہ یہاں "کو" کی جگہ "سے" ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ "سے" اور "کو" دونوں ہو سکتے ہیں اور اساتذہ کا کلام میرا مؤید ہے فخر المتقدمین والمتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ہیں:۔

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو مُنہہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو
مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی آ کے عیسیٰ سرِ بالیں نہ کہیں قُم مجھ کو

دُوسرے شعر میں کہنا کا مقولہ ایک مرکب تام یعنے قُم ہے اور حضرتِ مرحوم اسکا صلہ "کو" استعمال کرتے ہیں۔ مومن مرحوم فرماتے ہیں :-

یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں کو کہ دے پٹکے زمین پر آسماں کو
دیا اس بدگماں کو طعنۂ غیر غضب ہے کیا کہوں اپنی زباں کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جنکے انداز کے جناب حسرت وارفتہ ہیں فرماتے ہیں۔

کہیو اے بادِ صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی نہیں ہے دشت کے آواروں کو

اور لیجئے مرزا رفیع سودا دولت مند بخیل کی ہجو میں فرماتے ہیں :-

غرض اُٹھ کر چلا وہ جب واں سے کہ گیا کان میں یہ مہماں سے
چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو کہدو بلوا کے تم بکاول کو

مرزا نے پہلے شعر میں کہنا کا صلہ "سے" استعمال کیا ہے اور دوسرے میں "کو"۔ فرمائیے آپ کے دلیرانہ دعوے کی تردید ہوئی یا نہیں ؟

اعتراض دوم۔ حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں + اور رکھیں اسے کہاں کے لئے

مذکورہ بالا بحث میں میں نے ثابت کر دیا ہے کہ "کہنا" کا صلہ "سے" بھی آتا ہے اور "کو" بھی مگر اس شعر پر جو اعتراض کیا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ "کہنا" "تجھے" کے ساتھ بغیر صلے کے کبھی مستعمل نہیں ہوتا لہذا مجھ کو یہ ثابت کرنا ہے کہ جہاں "کہنا" کا مقولہ کلمۂ مفرد یا مرکب ناقص ہو خواہ اس سے مفعول ثانی کی صفت مترشح ہوتی ہو خواہ نہ ہوتی ہو اور نیز جہاں "کہنا" کا مقولہ مرکب تام ہو "کہنا" "تجھے" کے ساتھ بغیر صلے کے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ بلکہ "مجھے" اور "تمہیں" بھی اس قاعدے سے آزاد نہیں ہیں۔ (استاد)

کیا مدح ہے یہ جو تجھے ہم شاہ کہیں ہیں
سچے ہیں وہی لوگ جو اللہ کہیں ہیں

(میر تقی علیہ الرحمۃ)

ایک مولا کہے ہیں ایک خدا کہتے ہیں
یا علی جو تجھے کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

(میر تقی علیہ الرحمۃ)

نالے کیا نہ کرسنا! نوحے پہ میرے عندلیب!
بات میں بات عیب ہی میں نے تجھے کہا نہیں؟

(میر تقی علیہ الرحمۃ)

ہم نشیں تجھ سے میں وُہ خاک کہوں خلوت میں
آج جو اس نے کہا ہے سرِ بازار مجھے

(مرزا داغ دام فیضہ)

ع وُہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

(مومن مرحوم)

ناصح یہ مجھے راست کہے تھا کہ بجز داغ
کیا لیویگا دل دے کے تو ان لالہ رخاں کو

(مرزا رفیع سودا مرحوم)

ع کیا کہئے تمہیں حضرتِ دل بے ادبی ہے

(ظفر مرحوم)

حضرت امیر مرحوم رُوحی فداہ کا بھی ایک شعر یاد آگیا:-

قاصد! یہ زباں اس کی بیاں اسکا نہیں ہے
دھوکا ہے! تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے

مگر اس شعر کی دو توضیحیں ہوسکتی ہیں ایک اعتبار سے یہ میرے دعوی کا موئید ہوسکتا ہے دُوسرے اعتبار سے نہیں ہوسکتا۔ "تنقید ہمدرد" صاحب انصاف کریں۔ بے قصور اقبال اُردو کو الٹی چھری سے ذبح کرنیکا مجرم نہیں ہے۔ ہاں! اُس نے اساتذۂ اُردو کی پیروی کی ہے اگر یہ تقلید جُرم ہے تو اَنَا اوّل المجرمین!

اعتراضِ سوم - جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں الخ

"ہوا آنا" محاورۂ اردو نہ ہوگا - میرا مقصود بھی تو محاورہ نہیں ہے - خانِ آرزو مرحوم نے بھی اِسی قسم کا ایک اعتراض شیخ علی حزین علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر کیا تھا - مگر مولانا صہبائی مرحوم اُس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ "ایرادِ الفاظ گاہے بطریقِ محاورہ و روزمرہ بود کہ مردم را باہم درادائے مدعا بے تکلف اتفاق افتد و گاہے برائے تناسب و رعایتِ محسناتِ بدیعی الخ" - میرے شعر میں پھولوں کو جو مناسبت ہوا اور باغ سے ہو وہ ظاہر ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کیا گیا - ہاں! اگر آپ کے اعتراض کا مفہوم یہ ہو کہ "آنا" ہوا کے ساتھ اردو میں مسموع نہیں ہے تو ظفر دہلوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:-

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی
حباب آسا جو میرا ہو گیا ہے پیرہن ٹھنڈا

اعتراضِ چہارم - آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح + اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح -

"تنقید ہمدرد" صاحب فرماتے ہیں کہ "بناؤں" اور "دیکھوں" کا قافیہ غلط ہے - نکتہ چینی کرنے میں تو آپ نے کوئی تامل نہ کیا مگر یہ نہ بتایا کہ غلطی کیا ہو - ذرا یہ بھی تو معلوم ہوتا کہ آپ کو اصولِ فنِ قافیہ سے کہاں تک واقفیت ہو - خیر! مجھے اس بحث سے کام نہیں - میں آپکی خدمت میں مختصر طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس قافیہ میں ایطائے خفی ہے جس کو شایگان کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں - میں تسلیم کرتا ہوں کہ قواعد قافیہ کے رُو سے یہ قافیہ غلط ہے - مگر جیسا کہ میں ابھی ثابت کرونگا - متقدمین اور متاخرین میں سے کسی اُستاد نے فنِ قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی اور شایگان اساتذۂ فارس و ہند کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے - مثلاً عبدالوہاب نشاط شیرازی جو اساتذۂ حال میں سے

ہیں۔ ایک قصیدے میں فرماتے ہیں :-

یا کہ گوئی از بلائے زاہداں جاں بُردہ ام — نیم جانے بر درِ پیرِ مُغاں آوردہ ام
بندگاں را قابلِ خدمت نبودم خویش را — با ہزار اُمید در سلکِ سگاں آوردہ ام

ان اشعار میں "مغان" اور "سگان" کا قافیہ ہے۔ ہر دو الفاظ میں "ان" جمع کی علامت ہے لہٰذا یہ دونوں حروف وصل و خروج ہیں اصل قافیہ مغ اور سگ کا ہے اگر جمع کی علامت ساتھ نہ ہوتی تو اکفا ہو جاتا جو عیوب قافیہ میں سے ہے۔

علی ہذا القیاس مومن مرحوم کے اس شعر میں "پھر دل میں مرے لگی ہے آتش + نالے سے برس رہی ہے آتش" اور شیخ ناسخ مغفور کے اس شعر میں "جب وادیٔ وحشت میں گذر میرا ہوا ہے۔ ہر ایک بگولا پئے تعظیم اُٹھا ہے" بھی قافیہ شائگان ہے۔ حضرت امیر مینائی مرحوم کا مطلع ہے "سنگدل تجھ کو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک + میری سودش کے لئے غیر سے سازش کب تک"۔ "ش" یہاں وصل ہے اصل قافیہ کاو اور ساز کا ہے۔ جو اختلاف روی کی وجہ سے غلط ہے مگر وصل نے اس عیب کو پوشیدہ کر لیا ہے چونکہ حضرت مرحوم نے روف کی رعایت رکھی ہے جو ضروری تھی اسواسطے بادی النظر میں قافیہ غلط نہیں معلوم ہوتا۔ ساز کا صحیح قافیہ نواز تھا۔ جیسے میر انیس علیہ الرحمۃ کے اس شعر میں ہے :-

راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزندِ ید اللہ سے سازش کی ہے

سید فضل الحسن حسرت موہانی ایڈیٹر اردوئے معلّٰی ایک غزل میں فرماتے ہیں :-

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے — رسم پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے
ہم سے ظاہر میں وہ ہر چند خفا ہیں لیکن — کوشش پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

ان اشعار میں "اوقات" اور "حالات" کا قافیہ بھی شائگان ہے۔ "ات" دونوں جگہ علامتِ جمع ہے لہٰذا یہ دونوں حروف زوائد ہیں اصل قافیہ اوق اور حال کا ہے جس میں اختلاف

روی ہے یا یُوں کہو کہ مصنف نے روی کا لحاظ ہی نہیں کیا "بناؤں" اور "دیکھوں" کا قافیہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہاں "وں" بوجہ علامت صیغہ واحد متکلم ہونے کے زوائد میں اصل قافیہ بنا اور دیکھ کا ہے جس میں اختلاف روی ہے یا یوں کہو کہ روی کا لحاظ ہی نہیں رکھا گیا۔

اب "تنقید ہمدرد" صاحب خود ہی انصاف کریں کہ جب اساتذہ فارس ہند و دیگر شعرا شائگان کو بلا تکلف استعمال کرتے ہیں تو میں اس کے استعمال سے عرضۂ تیرِ ملامت کیوں ہوا؟ بلکہ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ اساتذۂ قدیم وحال نے فن قافیہ کے تمام بڑے بڑے اصولوں کی پروا نہیں کی۔ مثال کے طور پر چند اشعار عرض کرتا ہوں:-

(۱) مولانا شمس الدین فقیر صاحب حدائق البلاغت فرماتے ہیں کہ حروف تاسیس و دخیل کے سوا اور کل حروف قافیہ قبلِ روی ہوں یا بعدِ روی سب کی رعایت و تکرار واجب ہے اور اختلاف ناجائز۔ مگر فردوسی اس اصول کی پروا نہیں کرتے اور فرماتے ہیں:-

چہ گفت آں خداوند تنزیلِ وحی
خداوندِ امر و خداوندِ نہی

اس شعر میں حائے حُطّی اور ہائے ہوّز دونوں قید ہیں۔ ان کی رعایت مندرجہ بالا اصُول کے رُو سے ضروری تھی۔ البتہ بعض عروضیوں نے لکھا ہے کہ جہاں حروفِ قید قریب المخرج ہوں وہاں اس اصُول کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس شیخ سعدی کے اس شعر میں "چناں نادر اُفتادہ در روضہ + کہ در لاجوردی طبق بیضہ" و (ردف) کی رعایت ضروری تھی مگر بلبلِ شیراز نے اپنی نغمہ سرائی کے جوش میں کچھ پروا نہیں کی

(۲) مولانا عطاء اللہ شاگرد مولانا جامی علیہ الرحمۃ اور صاحبِ حدائق المعجم (شمس قیس خوارزمی) فرماتے ہیں کہ اختلافِ توجیہ ہرگز جائز نہیں البتہ روی متحرک ہو تو جائز ہے مگر فصحا کا دستور العمل بسا اوقات اس اصول کا مخالف ہوتا ہے۔ مثلاً:-

تواں صوفِ سخن را ساخت مُعلم کہ ریشم خامۂ اش نبود بریشم
(وفی یزدی)

درخشاں کرد چوں تیغ از بلالک | بماہی گاو گفتا کیف حالک
(نظامی علیہ الرحمۃ)

بمے در فروغیکہ چوں بردمد | زسیمائے مے خوارہ نیر دمد
(مرزا غالب علیہ الرحمۃ)

خوشا احوالِ یارانِ گذشتہ | کہ جن کی زیست تھی رشکِ فرشتہ
(مرزا رفیع سودا)

ان چہار اشعار میں ماقبلِ روی کی حرکات میں اختلاف ہے حالانکہ روی ساکن ہے۔
(۳۳) عروضی متفق ہیں کہ حرفِ مکتوبی کا قافیہ اس غیر مکتوبی کے ساتھ جو تلفظ میں ہو درست نہیں ہے مگر اساتذہ حال اس اصول کے پابند نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت امیر اللہ تسلیم دام فیضہ فرماتے ہیں:۔

قید اپنا وہ آپ پر فن تھا | حلقۂ زلف طوقِ گردن تھا
عذر مانع نہ تھا کوئی تسلیم | ترکِ شعر و سخن یہ قصداً تھا

اور برق مرحوم فرماتے ہیں:۔

یار مَن مَن کے بگڑ جاتا ہے | کام بَن بَن کے بگڑ جاتا ہے
یہ ترا ڈر ہے کہ بوسوں کا کھیل | ادبا بَن کے بگڑ جاتا ہے

غرضیکہ اس قسم کی صدہا مثالیں اساتذہ کے کلام میں ملتی ہیں جنکو متقدمین اور متاخرین کی دواوین و قصائد پر عبور ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتے ہیں بعض شعرا نے صلاح اور راہ غیاث اور ادا اس کا قافیہ باندھا ہے اور خواجہ حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے تو روی کو ایک مصرع میں متحرک اور ایک میں ساکن بھی لکھدیا ہے۔ قافیہ تو ایک طرف بعض اساتذہ لکھنو نے ردیف میں بھی بڑی آزادی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ شیخ ناسخ مغفور فرماتے ہیں:۔

کردیئے خط نے ترے عارضِ پُر نور سیاہ ہوگیا مُشک کی مانند یہ کافور سیاہ
پاس جو بیٹھ کے پڑھتے تھے غزل وُہ گئے دن اب تو ناسخ کبھی کراتے ہیں ہم دُور سے آہ

حقیقت یہ ہے کہ زبان کے اصُول اساتذہ کے کلام سے مستخرج ہوتے ہیں جو کچھ اکابر شعرا کے کلام میں آگیا ہے۔ وُہی سب کا دستور العمل ہونا چاہئیے۔ شیخ مُصحفی علیہ الرحمۃ کیا خُوب فرماتے ہیں :-

حاصل ہر زمانے ہیں جنہیں نظمِ طبیعی نظم اُنکی کے اشعار بہ از آبِ رواں ہیں
پرواہ انہیں کب ہی ردیف اور روی کی کب قافیہ کی قید میں آتش نفساں ہیں
مجھ کو تو ردیف آتی ہے نہ قافیہ چنداں اِک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

اعتراض بنجم - ہاتھ آئے مفلسی صفا ہی ترا + ہائے کیا تیرے خطا ہی ترا

آپ کو صفا بمعنے صاف کے جواز میں تامل ہے مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ اہلِ زبان کے تصرفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بسا اوقات مصدر کو بمعنے اسم فاعل استعمال کرتے ہیں جس طرح اُردو والوں نے صفا (مصدر) کو صاف کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اِسی طرح اساتذہ پارس نے مصدر زوال کو بمعنے زائل کنندہ استعمال کیا ہے۔ حکیم افضل الدین خاقانی خلیفہ بغداد کی تعریف میں فرماتے ہیں :- ع ابرِ انعامش زوالِ قحط قحطان آمدہ"

علیٰ ہذا القیاس کبھی حال کو اسم فاعل کے معنوں میں (مستانہ بمعنے مست) بولتے ہیں مثلاً "اُدھر دیوانہ جاتا ہے اِدھر مستانہ آتا ہے"۔ (داغ) اگر صفا بمعنے صاف کے اِستعمال میں کلام ہو تو حضرت داغ دام فیضہٗ کا یہ مطلع ملاحظہ فرمائیے :-

آئینہ منھ پہ بھلا اور بُرا کہتا ہے
سچ ہے یہ صاف جو ہوتا ہی صفا کہتا ہے

دہلی مرحوم کی زبان پر اعتبار نہ ہو تو میر انیس علیہ الرحمۃ کا یہ مصرع ملاحظہ ہو :-
ع بُت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے؟

البتہ ظفر کا یہ شعر قابلِ اعتبار نہیں ہے کیونکہ یہاں صفا بمعنے صاف بترکیبِ فارسی بندھا ہے اور فارسی میں صفا بمعنے صاف مستعمل نہیں ہے:۔

وُہ آئینہ ہے کہ جس کو ہے حاجتِ سیماب
اِک اضطراب ہے کافی دلِ صفا کے لئے

اعتراض ششم۔ شورِ آوازِ چاکِ پیراہن + لبِ اظہارِ مدعا ہے ترا

اِس شعر میں ایک نازک بات تھی مگر افسوس آپ نے تدبر نہ کیا اور یہ اعتراض کر ہی دیا کہ شور لب کیونکر بنگیا۔ مینا خانۂ خیال کے تماشائی ہو کر ایسی جُنبشِ مژگاں سے رنگِ تماشا کو "توڑنا" مناسب نہ تھا۔ اقبال ہیچمدان عرض کرتا ہے کہ لبِ اظہار میں اضافتِ بیانی ہے۔ آپکا اعتراض صحیح ہوتا اگر لبِ اظہار سے حقیقی لب مراد لی جاتی۔ ہاں! اضافتِ بیانی کی سند چاہو تو حاضر ہے:۔

شیخ علی حزین علیہ الرحمۃ:۔ صفِ مژگانِ تو گر عکس بہ دریا فگند - خارِ قلاب بود در بدنِ ماہیِ ما

مرزا غالب علیہ الرحمۃ:۔ کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ - بسانِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

پس جب "ماہیِ ما" اور "میرے آئینہ" سے میں "مراد ہو سکتی ہے تو لبِ اظہار سے اظہار کیوں مراد نہ ہو اور اظہار اور شور میں جو مناسبت ہے وُہ ظاہر ہے۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ آپ اس توضیح کو قبول کریں ایک اور تشریح پیش کرتا ہوں شاید سمع قبول سے شرف اندوز ہو۔ شور کو لب کے ساتھ اظہار میں مشارکت ہے۔ پس یہ استعارہ بے تکلف ہے۔ اور استعارہ بے تکلف تمام فصحا کے نزدیک جائز ہے۔ علمِ معانی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ لیکر پڑھئے۔ اُس میں بھی اس قسم کے استعارے کو جائز لکھا دیکھئے گا۔ قطع نظر اس بات کے آپ خوب جانتے ہیں کہ استعارے کا میدان وسیع ہے۔ شاعر اہلِ زبان کے محاورات کا پابند ہوتا ہے اور یہ پابندی ضروری ہے۔ لیکن اہلِ زبان کے تخیلات کی پابندی ضروری نہیں۔ یہ ضرور نہیں کہ اگر متقدمین نے گلشنِ طور لکھا ہے تو ہم بھی گلشنِ طور ہی لکھا

کریں جس شخص نے ملا ظہوری پر یہ اعتراض کر دیا تھا کہ "آتش بیگانہ" مسموع نہیں ہے میری رائے میں وہ غلطی پر تھا کیونکہ ظہوری کا تخیل ایرانیوں کے تخیل کا مقلد نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال سے مرزا بیدل علیہ الرحمۃ نے فارسیوں کی پروا نہ کر کے "خرام کاشتن" (ہر گاہ دو قدم خرام مے کاشت) لکھدیا اور نافہموں نے اُن کی آزادیٔ تخیل کو سہام اعتراض کا نشانہ بنایا۔ متقدمین میں سے ناصر علی سرہندی علیہ الرحمۃ اور مرزا جلال اسیر بھی ان قیود سے آزاد ہیں۔ خواجہ آتش مرحوم "گرگ بغل" تحریر فرماتے ہیں اور حضرت امیر مرحوم کے اشعار سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

ع "ہیں بارِ خاطرِ قفس و آشیاں نہیں"

غالباً گرگ بغل اور خاطر قفس کا استعارہ آپ کسی ایرانی یا اردو شاعر کے کلام میں نہ پائینگے پس میری رائے میں استعارے پر اعتراض کرنے کا حق کسی محقق کو حاصل نہیں اِلّا اس صورت میں جب کہ استعارہ اصلیت سے معرا ہو۔ باوجود اس تشریح کے مجھے پھر بھی خیال ہے کہ آپ مذکورہ بالا رائے کو تسلیم کرنے میں ضرور تامل کرینگے۔ اِس واسطے میں اپنے استعارے کی تائید میں شیخ علی حزین علیہ الرحمۃ کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جس طرح میں نے لب سے مراد آوازِ لب یا گفتار لی ہے اِسی طرح شیخ علیہ الرحمۃ اپنے شعر میں ناقوس سے مراد آوازِ ناقوس لیتے ہیں:-

سرِ کار فرشتن داریم کو بُت خانۂ عشقے
کہ ناقوسش بجائے نغمۂ یا حی شود مارا

اِس سند پر بھی آپ اپنے اعتراض کی غلطی کو تسلیم نہ کریں تو آپ کی مرضی۔ میری رائے میں تو اس قسم کے استعارے کی تائید میں اس شعر سے بڑھ کر اور کوئی سند نہیں ہو سکتی۔ ماشاءاللہ آپ ایک تعلیم یافتہ اور محقق آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سر رشتۂ انصاف کو ہاتھ سے نہ دینگے۔

اعتراض ہفتم — اِس جہاں میں اِک معیشت اور سو اُفتاد ہے الخ

آپ کے رائے میں یہاں "سو افتاد" کی جگہ "سو افتادیں" ہونا چاہیئے مگر آپ اعتراض کرنے سے پہلے یہ تو سوچتے کہ الفاظ دیں - سو - ہزار - لاکھ - سینکڑوں اُردو زبان میں واحد تصور کئے گئے ہیں اسواسطے انکا معدود واحد ہو سکتا ہے اور فصحا نے واحد استعمال کیا ہے - آپ لکھنوی ہیں یا لکھنؤ کی زبان کے مقلد ہیں اسواسطے میں سند میں اساتذۂ لکھنؤ کے اشعار پیش کرتا ہوں :-

خواجہ حیدر علی آتش مرحوم :- مشقِ ناوک افگنی کرتا تھا جب وہ ماہرو + سینکڑوں ہی تودۂ خاکستر پروانہ تھا

شیخ ناسخ مغفور :- تھی نہ اُمید رہائی کی دلِ ناسخ کو + لاکھ زنجیر ترے گیسوئے خمدار کی تھی

حضرت تسلیم دام فیضہ :- خال و مژگاں کے عشق سے دل میں + سینکڑوں داغ لاکھوں روزن تھا

حضرت جلال مدظلہ :- نظر آتی نہیں مجھ کو وہ دس منزل میں رہتی ہیں + مری آنکھوں کی پتلی ہیں نگہ میں تل میں رہتی ہیں

اعتراض ہشتم — ع مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

معلوم نہیں آپ کا اعتراض اس مصرع کی زبان پر ہے یا مفہوم پر - "سیدھا کرنا" کے معنے یہاں وہی مراد لئے گئے ہیں - جو میر ممنون دہلوی کے اس شعر میں ہیں :-

تیرے قامت نے کیا خوب ہی سیدھا اسکو — سرو گلشن کو بہت دعوئے رعنائی تھا

اگر آپ یہ کہیں کہ اس محاورے کا اطلاق اپنی ذات پر نہیں ہو سکتا تو صحیح نہیں کیونکہ ظفر مرحوم کا مطلع ہے :-

عشق میں کیا ہم ہی اے تقدیر سیدھے ہو گئے
کتنے اِس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہو گئے

اصل میں سیدھا کرنا فارسی محاورہ راست کردن کا ترجمہ ہے اور یہ محاورہ صوفیائے کرام کے اشعار میں بکثرت پایا جاتا ہے -

یہی وُہ راستی ہے جو عشق کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا اثر سکندر کے آئینے کو جمشید کا جامِ جہاں نما بنا سکتا ہے - حرمان نصیب اقبال کو اِسی راستی کی آرزو ہے - مگر افسوس آپ نے اس تمنائے محمود کو مذموم تصوّر فرمایا !! کاش آپ اس رمز سے آگاہ ہوتے ! ہاں ! مَیں تسلیم کرتا ہُوں کہ اس مصرع میں پہلوئے ذم ضرور ہے - اور پہلوئے ذم کس اُستاد کے کلام میں نہیں ؟ حضرت جلال لکھنوی فرماتے ہیں - ع سلامت رہو کیا لگائی ہے ٹھوکر - اور میر تقی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں - ع ہے راہ "تنگ ایسے جیسے سُوئی کا ناکا" - اور ملال لکھنوی کا مصرع تو سب کو معلوم ہے - دیگر اساتذہ کے کلام میں بھی کئی مثالیں پہلوئے ذم کی موجود ہیں - مگر میں انہیں نظر انداز کرتا ہُوں - اب آپ خود انصاف کریں کہ بڑے بڑے فصحا اس سے نہیں بچ سکے تو اقبال کی کیا حقیقت ہے !

اصل بات یہ ہے کہ کسی شعر یا عبارت کا ایسا مفہوم سمجھنا پڑھنے والے کی اپنی طبیعت پر منحصر اور اس کے اندرونی خیالات کے میلان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے - مرزا بیدل علیہ الرحمۃ والغفران فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں :-

میوہ و نقل و ترشح ہر یکے بار ہست و بس لیک مے باید بہر موقع جُدا فہمد کسے
تار در ہر جا مقام ساز گردید ست صرف طبع گر روشن بود ظلمت چرا فہمد کسے

مَیں نے اپنے فہم قاصر کے مطابق آپ کے تمام اعتراضات کا جواب دیدیا ہے - البتہ "مَیں نے" پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے وُہ صحیح ہے - چُونکہ یہ محاورہ مخصوصاتِ پنجاب میں سے ہے - اِس واسطے مَیں اُس کی تائید میں کوئی شعر فصحائے دہلی و لکھنؤ کے کلام میں سے پیش نہیں کر سکتا - لیکن اتنا عرض کئے دیتا ہُوں کہ جس نظم کے شعر پر آپ نے یہ اعتراض کیا ہے اِس میں بعض اَور بھی پنجابی الفاظ و محاورات استعمال کئے گئے تھے معلوم نہیں آپ کی حرف گیری اِسی محاورے تک کیوں محدود رہی - بہر حال مَیں اِس لغزش کو تسلیم کرتا ہُوں - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب میں یہ محاورہ زبان زدِ عام ہے -

اور شب و روز سُنتے سُنتے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ بے احتیاطی میں زبان یا قلم سے نکل جاتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پنجاب میں پڑھے لکھے آدمی اُردو کے مستند محاورے سے جس میں "مَیں نے" کی بجائے "مجھ کو" استعمال ہوتا ہے۔ ناآشنا ہیں۔ میرے اشعار بہت سے موجود ہیں۔ جن میں اس محاورہ کا صحیح استعمال ہے۔

مَیں آپ کا مشکور ہُوں کہ آپ کے مضمون سے میری طبیعت تحقیق کی طرف مائل ہُوئی اور کیا تعجب ہے کہ میرا جواب آپ کی طبیعت پر بھی یہی اثر کرے۔ آپ مطمئن رہیں مجھے اساتذہ کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے۔ اگر اہلِ پنجاب مجھ کو یا حضرتِ ناظر کو بہمہ وجوہ کامل خیال کرتے ہیں تو اُن کی غلطی ہے۔ زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اور یہ ایک ایسی دشوار گذار وادی ہے کہ بالخصوص اُن لوگوں کو جو اہلِ زبان نہیں ہیں یہاں قدم قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ ہے۔ قسم بخدائے لایزال میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ مَیں باوجود اپنی بے علمی اور کم مائگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہُوں۔ ورنہ مجھے نہ زباندانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔

راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں:۔

نیم من در شمارِ بلبلاں اما بایں شادم
کہ من ہم در گلستانِ قفس مشتِ پرے دارم

اقبال

عربی بول چال:۔ زبانِ عربی کی تحصیل کے شائقین یہ سُنکر خوش ہونگے کہ جناب حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری کی کتاب "عربی بول چال" جسکی تعریف پہلے کی جا چکی ہے۔ دوبارہ پہلے سے بھی مفید مطالب کے اضافہ کے ساتھ طبع ہُوئی ہے۔ جو صاحب چاہیں حافظ صاحب موصوف (کشمیری بازار۔ لاہور) سے طلب فرمائیں۔

اچھے کپڑے

شہزادہ مرزا محمد عبد الغنی صاحب ارشد گورگانی دہلوی کے نام نامی سے پنجاب کا ہر علم دوست واقف ہے اور اُن کا کمال اور شہرت محتاجِ تعریف نہیں - ہم نے اُن سے بارہا درخواست کی تھی - کہ وُہ مخزن کو اپنے کلام سے مستفید فرماویں - اب کے اُنکے شاگردِ رشید جناب بسمل کی توجہ سے یہ نتیجہ خیز اور دلچسپ نظم ہمیں ملی ہے - ہم مرزا صاحب کے مشکور ہیں اور بسمل صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں - کہ اُنھوں نے نظم نقل کر کے روانہ کی -

بسمل صاحب نے مندرجہ ذیل تمہیدی عبارت ساتھ لکھی ہے :-

آپ یہ نظم پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس اعلیٰ پایہ کا پختہ اور شستہ استادانہ کلام ہے خاص محلسرائے دہلی کی زبان ہے جو کہ اُردوئے معلّٰے کے نام سے موسوم ہے شہزادہ صاحب یادگارِ خاندانِ تیموریہ ہیں - آپ نے مرزا قادر بخش صاحب صابر مرحوم دہلوی سے جو کہ حضرت غالب و ذوق مرحوم کے ہمعصر ہو گذرے ہیں - فنِ شاعری سیکھا اور آسمانِ کمال پر پہنچایا - ہندوستان میں حضرت داغ و حالی کے ساتھ آپکا نام بھی اُستادوں میں شمار کیا جاتا ہے - خداوند کریم آپ کو سلامت رکھے - انشاءاللہ آپ کا ہر قسم کا کلام وقتاً فوقتاً بھیجا جائیگا -

اچھے کپڑوں پہ جو مغرور ہیں اتراتے ہیں
وُہ چھچھورے کا گھمنڈی کا لقب پاتے ہیں

عُجب ہیں جامے سے ہو جاتے ہیں اکثر باہر
اندر اندر ہیں یہ ملبوس کے باہر باہر

آنکھ سینے پہ اکڑفوں سے جو پڑ جاتی ہے
تیز برچھی ہے کلیجے میں جو گڑ جاتی ہے

خوشنما آپ سمجھتے ہیں کہ چھب تختی ہے
دیکھنے والے یہ کہتے ہیں کہ کمبختی ہے

ان کی آنکھوں میں کھُبا حسن شمائل انکا
پر نظر باز نہیں ہے کوئی قائل ان کا

ڈھنگ جب دیکھتے ہیں اُن کی تو سب کہتے ہیں ۔ کہ یہ قندیل ہیں کپڑوں سے منڈھے رہتے ہیں

تھوڑی سی سوت کی انٹی پہ یہ بہکا خبطا ۔ کہ ہے دشوار انہیں اصل میں انساں بننا

یہ وُہ گڈے ہیں کہ روہڑ پہ ہیں اترائے ہُوئے ۔ زندہ پتلی ہیں کہ کپڑوں سے ہیں کفنائے ہُوئے

دل میں کہتے ہیں کہ خلقت ہمیں سرکار کہے ۔ خوبصورت کہے زردار طرحدار کہے

ظاہری جسم کا کپڑوں کو بنا کر پردہ ۔ کرتے ہیں پردہ دری اپنی مگر در پردہ

مفتخر بنتے ہیں جھم جھم کے پہن کر کپڑے ۔ مُفت۔ خر بنتے ہیں جھم جھم کے پہن کر کپڑے

ریشمی تھیلے ہیں گر خاک بھری جائے تو کیا ۔ بزم میں فاخرہ ملبوس پہن آئے تو کیا

ایسٹر این ہوا پوشاک کے اندر ننگا ۔ جس طرح ریشمی کپڑوں میں رہے بِھک منگا

خُوب پوشاک میں عریاں ہے طبیعت انکی ۔ کہ امیری میں فقیرانہ ہے عادت انکی

جنکے کچھ پاس نہیں ہے وُہی اتراتے ہیں ۔ پاس ہے جنکے وہ چپ چاپ نظر آتے ہیں

اتنا حیوانوں کے صدقے پہ اکڑفوں کرنا ۔ کیا کبوتر سے اُڑایا ہے غٹر غوں کرنا

اُون کا بیان

اون کیا چیز ہے کچھ بال ہیں اور کچھ بھی نہیں ۔ ظاہری جال ہیں جنجال ہیں اور کچھ بھی نہیں

نہ یہ معشوق کی زلفیں ہیں نہ اب گیسو ہیں ۔ نہ یہ سُنبل نہ بنفشہ ہیں نہ عنبر بو ہیں

نہیں وُہ دام کہ عالم کو پریشان کریں ۔ نہ بلا ہیں کہ چڑھیں سر پہ تو ہیجان کریں

نہ دُھواں دھار گھٹا ہیں کہ اُٹھا کر طوفاں ۔ خشک کر دینگی ابھی غلہ فروشوں کی جاں

نہ یہ تاتار کا نافہ ہیں نہ یہ مُشکِ ختن ۔ رُوئے دشمن ہیں سیاہی میں نہ کالی ناگن

ان میں آدھی بھی نہیں عنبرِ سارا کی مثال ۔ جعد پُر پیچ کا اک پیچ نہیں ہے فی الحال

شبِ یلدا شبِ ہجراں شبِ دیجور نہیں ۔ بال ہیں اُترے ہُوئے کچھ جنہیں مقدور نہیں

دستِ مقراض نے جڑ اُن کی اُڑائی ہوگی ۔ تیزی ہر وار پہ چل چل کے دکھائی ہوگی

اُسترے نے انہیں سر پہ سے اتارا ہوگا ۔ خاص یہ خاص[۱] تراشوں کا اشارا ہوگا

۱؎ بادشاہی حجام کو خاص تراش کہتے ہیں۔

کر دیا جمع جلاہوں نے پریشانی سے — قیمتی بن گئے کچھ بے سروسانی سے
آپنے دام دیئے پھنس گئے خود جال میں آپ — دلِ عاشق کی طرح قید ہیں ہر بال میں آپ
انکی تعریف کی رسّی کو لپیٹے رکھو — سخت زنجیر ہے پاؤں کو سمیٹے رکھو

مثال

بھیڑ وُہ بھیڑ غریبی میں ہے شہرت جس کی — کوئی دس بیس روپے بھی نہیں قیمت جسکی
اِسی پوشاک سے ہے تن کو سجائے رکھتی — گرمی اور سردی سے جسم اپنا بچائے رکھتی
برف و بارش میں اسی سے ہُو رکاوٹ اسکی — رات دن ہے اِسی خلعت سے سجاوٹ اسکی
خاک اور پانی سے اکثر اسے بھرتے دیکھا — پر نہ تن پر سے یہ ملبوس اترتے دیکھا
آپ کی طرح جو اس اُون پہ اتراتی بھیڑ — پُھول کر بھیڑ سے بس بھیڑیا بن جاتی بھیڑ
اپنے ہم جنسوں کو اِک لات میں پڑا لیتی — ایسا کرتی تو وُہ نادان بھلا کیا لیتی
فخر ہے بھیڑ کی اُترن پہ تمہیں واہ جی واہ — چند بالوں کے سبب اتنے ہُوئے ہو گمراہ
رکھیئے صندوق میں کاغاں کا السٹر اپنا — نہ ظریفوں سے بھرواؤ پلسٹر اپنا
چُپ رہو اتنی بلنکٹ کی نہ تعریف کرو — مایۂ فخر سمجھتے ہو تو گٹھڑی میں دھرو
رونگٹے دیکھ کے کمبل کے کھڑے ہوتے ہیں — ریچھ سُنتے ہیں تو حیران بڑے ہوتے ہیں
نرم گدّا ہے تمہارا تو ہمیں کام نہیں — کوئی بھٹّی نہیں چُولہا نہیں حمّام نہیں
نہ کرو لاف زنی نرم اگر ہے پٹّو — داغ دے دیکھنا نالش نہ پہاڑی ٹٹّو
ہم نے مانا کہ ہے انمول تمہارا دُھسّا — کیا زمانے میں کوئی اور نہیں ہے اُس سا
بلّی کی دُم ہے نہ اِتراؤ ذرا اقُم پر — تم ہو مردُم کہیں بلّی نہ ہنسے اس دُم پر
ہو مُبارک تمہیں انمول ہے گر پاس سمُور — ڈھونڈتے پھرتے ہیں خرگوش چُھپیں گھر میں حضور
ہے جو زردار دوشالہ تو چھپا کر رکھو — ہو جو سادہ کوئی جوڑا تو اُسے گھر رکھو
کارچوبی جو مداخل ہے تو مغرور نہ ہو — فلسِ ماہی دُمِ طاؤس کی خوبی دیکھو

رنگ کی تعریف سُنینگے تو کہینگے بدرنگ
دیکھو دیوانے نہ ہو رہتا ہی رنگ زن لگ بھگ

پہنو اچھّے سے بھی اچھّا نہ مگر اتراؤ
رگِ غیرت کو کبھی تو حرکت میں لاؤ

اَوروں کی پشم پہ اس طرح کا اترا جانا
ایسے دانا ہو کہیں گھانس نہ تم کھا جانا

—

آؤ اب ریشمی کپڑے کی حقیقت سُن لو
نرم و باریک مضامین بہ رغبت سُن لو

کس کا سرمایہ ہے ریشم ہمیں سمجھاؤ تو
کس ریاست کا خزانہ ہے بتا جاؤ تو

پیلہ اک کیڑا ہے جو بیل نہیں شیر نہیں
بیل سے شیر سے ہوتا وُہ کبھی زیر نہیں

تُوت کے پیڑ پہ کرتا ہے نشیمن اپنا
یعنے رکھتا ہے بلندی پہ وُہ مسکن اپنا

پھینک دیتا ہے وُہ فُضلہ تم اُٹھا لیتے ہو
اپنی ترکیب سے کچھ اسکو بنا لیتے ہو

اسی فُضلہ کا رکھا نام ہے تم نے پوشاک
اسی پوشاک کی ہے سارے زمانے میں دھاک

اسی پوشاک سے ظاہر ہے امیرانہ بَن
اسی پوشاک کی مشہور ہے دُنیا میں پھبن

—

رُومی مخمل کا جو ملبوس پہن آتے ہو
توشۂ روم ہی کاشانے میں بَن جاتے ہو

گاہ تو دھیان ہے سینے کی صفائی کی طرف
دیکھتے ہو کبھی خوش قطع سلائی کی طرف

آستینوں پہ کبھی ہاتھ جو پھر جاتا ہے
ہاتھ کو پاؤں پھسلنے کا مزا آتا ہے

روغنِ بستہ کا دریا ہے رواں کوسوں تک
ہاتھ اک ہاتھ میں ہوتا ہے رواں کوسوں تک

یہ تو سب کچھ ہے کہ وُہ مخمل کاشانی ہے
پہنا جس نے اُسے وُہ قابلِ سلطانی ہے

نہ مگر اس کی لجاجت کا سبب یاد رہا
عقدہ باریک تھا ہر تار میں کب یاد رہا

آنکھ تو نرمیِ مخمل پہ لگائی تم نے
خواب کی اس کے نہ تعبیر بتائی تم نے

ہے یہ اس خواب کی تعبیر کہ بیدار رہو
دِل ہے بیدار تو کیوں مائلِ پندار رہو

ہے یہ وہ خواب کہ سونا نہیں تعبیر اس کی
اور جو سونا ہے تو تعبیر ہے اکسیر اس کی

ہے یہ کمخواب ہی غفلت سے جگانے والا خواب سے مردمِ دیدہ کو اُٹھانے والا

تیتری کا کبھی دیکھا ہے سہیلا خلعت جامہ خوش قطع وہ کچھ اس پہ وُہ خود خوش طلعت
ٹکلیوں دار مثلث کی طرح کے دو پر اِس قدر نازک و باریک کہ ٹھہرے نہ نظر
چتیاں ان میں جو صد رنگ نظر آتی ہیں مینا کاری یہ قدرت کی یہ دکھلاتی ہیں
دمبدم کُھل کے پروں کا وُہ ادا سے مُڑنا انہیں دو پنکھوں سے وہ اسکا ہوا پر اُڑنا
تالیاں کیسی بجاتی ہے یہ ہر آن اُن سے پر ہیں دو تختِ رواں خود ہے سلیماں اُن سے
آپ کی طرح سے گر تیتری اِترا جاتی تو فلک پر کبھی اُڑتی نہ بلندی پاتی

کیسا ذیشان پرندوں کا ہے رنگیں بانا نہیں آتا ہے کسی ایک کو بھی اترانا
ایک پوشاک مہینوں نہ بدلتے دیکھا مدتوں تک اسی اک جامے کو چلتے دیکھا
ایک وردی ہیں وُہ خورسند رہا کرتے ہیں دیکھ کر سب اُنہیں خوش باش کہا کرتے ہیں
ہے جڑاول یہی اُن کی یہی بارانی ہے اسی جامے سے انہیں گرمی ہے ذیشانی ہے
جوڑا غم کا ہے یہی اور یہی شادی کا لباس ایک کترن بھی نہیں اس کے سوا انکے پاس
اسکو دھوبی کی نہ حاجت ہو نہ درزی کی تلاش سُوئی تاگے سے نہ مطلب ہو نہ ہو فکر تراش
یہی پوشاک پسِ مرگ کفن ہے اُن کا واہ کیا خوب فقیرانہ چلن ہے اُن کا
اپنے خالق کے عطیہ پہ رضامند ہیں وُہ جو مقدر سے ملا اُس پہ ہی خورسند ہیں وہ
کب ہیں درگاہِ خداوند میں کافر نعمت مثلِ انسان نہیں اُنکے لئے ہر نعمت
صاف ظاہر ہے بہائم کی یہ خاموشی سے کہ بری ہم رہے احسان فراموشی سے

باغ میں پھولوں کے وُہ رنگ وُہ جوبن وُہ بہار کہ تڑپ جائے نگہ دیکھ کے جنکو ہر بار

حسن صورت وہ غضب کا وہ ستم کا انداز
صورتِ حسن میں ہر ایک ہر اک سے ممتاز

جامہ وہ بوقلموں برمیں کہ اللہ اللہ
باغ کھل جائے تصور میں جو پڑ جائے نگاہ

شام کی طرز نئی شان الگ روپ جدا
رنگ دیتی ہے انہیں چھاؤں جدا دھوپ جدا

جب نسیمِ سحری جسم کو چھو جاتی ہے
جو صفت دل میں بھری ہے وہ نکل آتی ہے

یہی خوشبو تو ہے مخزوں کو بسانیوالی
ہے یہی شان انہیں ہار بنانے والی

اپنی پوشاک پہ خوشبو پہ جو اترا جاتے
سرد سینہ پہ وہ انسان کے جگہ کیا پاتے

نتیجہ

پھول بننا ہے تو کپڑوں پہ نہ ہرگز پھولو
سو کی اک بات سناتے ہیں نہ اس کو بھولو

روح سے میل اتارو تو وہ آراستہ ہو
علم کے رنگ میں دو ڈوب تو پیراستہ ہو

اس سے بہتر کوئی پوشاک ہی انمول نہیں
جسم پر آئی ہے کیا ٹھیک کہیں جھول نہیں

داغ دھبوں سے سدا اسکو بچائے رکھنا
اس کی پاکیزگی پر آنکھ لگائے رکھنا

اسکا خالق نے بنایا ہے جو تانا بانا
اس کی باریک نزاکت کا وہی ہے دانا

عالمِ علوی و سفلی سے ہے وہ ہم رشتہ
ایک سے تو ہے سوا ایک سے ہے کم رشتہ

آگیا بوجھ گناہوں کا جو اس کے لگ بھگ
کا جو بوجھو سا ہی ہو جائیگا چٹ چٹ سا الگ

یہ وہ خلعت ہے نہیں خوف جسے رہزن کا
نہ تو کیڑے کا خطر ہے نہ پرائے پن کا

خواہ دنیا میں ہو کیسا ہی کوئی بادی چور
گل سے خوشبو کے چرا لینے کا ہو عادی چور

ہاتھ یہ مال کسی طرح نہیں آسکتا
ہاتھ کیا آئے یہاں ہاتھ نہیں جا سکتا

خلعتِ خاصۂ دربارِ خداوندی ہے
واہ کیا بخشش سرکارِ خداوندی ہے

یا خدا ارشدِ عاصی کو وہ خلعت ہو عطا
جسکی خوبی میں ہو پوشیدہ ہر اک میری خطا

ابر و آسترِ اک جنس کے اک رنگ کے ہوں
ظاہری باطنی افعال کل اک ڈھنگ کے ہوں

صورتِ آبِ رواں صاف مرا دل ہو جائے
سہل آلودگی کی جتنی ہے مشکل ہو جائے

صفتِ موج اگر دل میں شکن آجائے ایک ہی دم میں صفائی بھی مگر آجائے
اسی ملبوس سے بازیبِ تنِ خاکی ہو دُور مجھ میں سے ہر اک زشتی و ناپاکی ہو

ارشد

تصفیۂ بقایا

(از چوہدری خوشی محمد صاحب بی۔اے)

گذشتہ سال نظم "جوگی" شیخ صاحب کے اصرار سے ناتمام بھیجدی گئی۔ اس میں عجلت کی وجہ سے جوگی جی کے بچن کا مفہوم ادا نہ ہوسکا۔ اور ناظر کی حجت قوی معلوم ہوتی تھی۔ جوگی جی دل میں کہتے ہونگے کہ ؎ قلم گر در انگشتِ شیر آمدے ۔ نہ ہرگز چنیں شیر زیر آمدے ۔۔ درحقیقت میرا ایسا منشا نہ تھا۔ اب جوگی جی کے جواب سے نظم کی تکمیل کرتا ہوں۔ جوابِ جوگی میں خطابِ ناظر کے سوا لُطف نہ آیگا۔ اس لئے خطاب مذکور کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ گذشتہ سال کتابت میں دو تین غلطیاں ہو گئی تھیں۔ مثلاً "ہم جوت جگاتے ہیں من کی" کے بجائے "ہم جوت لگانے ہیں" چھپ گیا تھا۔ اسکی معافی چاہتا ہوں اگر اب کے بھی کوئی ایسی ہی گستاخی سہوِ کتابت سے ہوجائے۔ تو اس کا کاتب ذمہ دار ہوگا نہ بندہ ناظر۔

خطابِ ناظر

ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہو ڈیرا کیوں
ہر منزل میں ہر محفل میں ہر دل میں ہے نُورِ خدا جوگی

سلہ یہ ریاست کے محکمہ مال کی اصطلاح ہے۔

کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہے ہر جا جوگی

جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حُسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساگر چلتا ہے چل دل کی پیاس بُجھا جوگی

واں دل کا غُنچہ کِھلتا ہے گلیوں میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دُھونی رما جوگی

(جواب جوگی)

اِن چکنی چُپڑی باتوں سے مت جوگی کو پُھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا

ہے شہروں میں غُل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھوں کی ہے بَن میں جا بابا

ہے شہر میں شورش نفسانی جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری نگری کثرت کی بَن وحدت کا دریا بابا

ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بُجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا

سر پہ آکاس کا منڈل ہے دھرتی پہ سُہانی مخمل ہے
دن کو سُورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جُھوم کے بادل گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا

یاں پنچھی ملکر گاتے ہیں پریتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں رُوپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھُول اور برگ گیا بابا

ہے پیٹ کا ہر دم دھیاں تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سِل پتھر اینٹ مکان تمہیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا
دھن دولت آنی جانی ہے یہ دُنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے باقی ہے ذاتِ خُدا بابا!

ناظر (از سری نگر)

غزل جناب شاد

(از عظیم آباد)

اکڑ کے دوش پہ کیونکر نہ زلف ناز کرے — اُسی کے ہاتھ ہے وُہ جس کو سرفراز کرے
بیک اشارہ نہ مَیں تھا نہ غیر محفل میں — اُن ابروؤں کی خدا زندگی دراز کرے
مرے حسابوں تو عاشق نہیں حریص ہے وہ — فراق و وصل میں کچھ بھی جو امتیاز کرے
نگاہِ ناز سے مطلب مرا کچھ اَور نہیں — کسی طرح سے خدا اُس کو دلنواز کرے
کچھ اَور بزم میں اپنی دُعا نہیں ساقی — تری نگاہ کو اللہ پاکباز کرے
کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر — کِدھر جھکائے سر انساں کِدھر نماز کرے
بہت دنوں سے ہے خالی فقیر کا کشکول — بس اب نگاہِ کرم وہ گدا نواز کرے
شرابِ جام میں دی تو نے ساقیا یا زہر — کسے دماغ ہے کون اُس کا امتیاز کرے
گلہ سر آنکھوں پہ ہے اسکا لیکن اَے قاصد — ہم ایسے ہیں تو ہمیں کیوں امینِ ساز کرے
فقط بھروسے پہ تیرے ہے زندگی اپنی — خدا حیات تری اَے اجل دراز کرے
ہم اپنے آپ نہیں جب تو ہونگے غیر کے کب — زمانہ شاد ہم ایسوں سے احتراز کرے

نوحۂ رشید

۲۰- ستمبر سنہ ۱۹۰۳ء کی شام کو بعد غروبِ آفتاب راقم جواں مرگ عبدالرشید چشتی بی-اے مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اُسوقت جن جذبات نے دل پر ہجوم کیا اُن کی عکسی تصویر ذیل کے چند شعروں میں کھینچی گئی ہے۔ چونکہ مرحوم کو مخزن سے خاص تعلق تھا جسکو مرحوم کی بیوقت موت نے عین ابتدا میں قطع کر دیا۔ اِس لئے ان سطروں کا مخزن میں جگہ پانا ناموزون نہ ہوگا۔

(نیرنگ)

اشکِ حسرت ترے مدفن پہ بہانے آیا
تو نے جو داغ دیا تجھ کو دکھانے آیا

مَرَضُ الموت میں بھیجا تھا جسے عید کا کارڈ
وُہ ترے بسترِ حنا کی کے سرہانے آیا

جس کے شعروں کو بہت شوق سے تو سنتا تھا
آج وُہ تجھ کو ترا نوحہ سُنانے آیا

رات اندھیری ہے طبیعت نہ پریشاں ہو تیری
شعلۂ آہ کی ایک شمع جلانے آیا

چھوڑ احباب کو سوتا ہے پڑا چین سے تو
نعرۂ درد سے مَیں تجھ کو جگانے آیا

ہائے جس کے لئے صد دولتِ بیدار تھا تو
وُہ پدر خود تجھے مرقد میں سُلانے آیا

جیتے جی پھُول سے تھی تجھ کو بہت کچھ نسبت
مَیں ترے ڈھیر پہ بھی پھُول چڑھانے آیا

ملتی جُلتی تھی بہت پھُول سے خصلت تیری
سیرِ گلزار سے کچھ کم نہ تھی صُحبت تیری

بُوئے گل جیسے کہ پھیلاتی ہے ہر سمت نسیم
اِس طرح پھیلی تھی اخلاق کی نکہت تیری

یار و اغیار میں کچھ فرق نہ تو کرتا تھا
مُسکراہٹ ترے ہونٹوں پہ تھی طینت تیری

تجھ کو کینے سے تعلق نہ تعصب سے لگاؤ
وسعتِ تامہ رکھتی تھی محبت تیری

جس طرح پھُول ہے دو روز میں کُملا جاتا
اس طرح تھوڑی سی تھی عمر کی مدت تیری

تھی خوشی تیری عزیزوں کو ملائے رکھنا بہجتِ خاطرِ احباب مسرّت تیری
تو وُہ تھا جس کو پیمبر نے کہا ہے "مومن"[1]
ہاتھ سے بول سے ایذا نہ تھی عادت تیری

گردشِ چنبرِ دوّار نے جینے نہ دیا چین سے تجھ کو ستمگار نے جینے نہ دیا
کچھ تو ارمان عزیزوں کے نکلتے اے کاش چار دن بھی تجھے خونخوار نے جینے نہ دیا
ایک جان اُس پہ یہ دن رات ہجومِ آلام کثرتِ مجمعِ افکار نے جینے نہ دیا
تُو تو رکھتا نہ تھا آزار کسی کا بھی روا ہائے تجھ کو ترے آزار نے جینے نہ دیا
تھا جس آئین کے نکتوں میں تعمّق تجھ کو اُسی آئینِ پراسرار نے جینے نہ دیا
شاہدِ راز کے جلوے کا جو تھا تو مشتاق ہاں اُسی حسرتِ دیدار نے جینے نہ دیا

سخت جانی سے ہی نیرنگ بھی آخر زندہ
تجھ کو کیوں موتِ جفاکار نے جینے نہ دیا

نیرنگ

اِستقلال

گر بہ فرقِ ما نہد صد کوہِ محنت روزگار
چینِ پیشانی نہ بیند گوشۂ ابروئے ما

پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلے تو ٹل جائے اور آفتاب بھی قبلِ عروج ڈھل جائے
مگر نہ صاحبِ ہمّت کا حوصلہ ٹوٹے کبھی نہ بھولے سے اپنی جبیں پہ بل لائے

[1] حدیث نبوی ہے المومن من یسلم المومنون من یدہٖ ولسانہٖ۔ مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے انسان بچا رہے ۱۲

ہزار بار ارادہ میں گو نہ نصرت ہو
مگر نہ پائے صداقت کہیں پھسل جائے

رقیب لاکھ ہوں حاسد ہوں سینکڑوں بیشک
حسد کی آگ میں بدخواہ خود ہی جل جائے

ہمیشہ دشت طلب میں ہو گرم رفتاری
ہزار عیش ہو مُنہہ موڑ کر نکل جائے

ہمیشہ فکر رہے دُوسروں کا دامنگیر
دلِ حزیں کو نہ اس بے کلی سے کل آئے

نہ کارِ خیر میں گاہے ہو اِلتوا ہرگز
جو کام آج ہو کرنا وہاں نہ کل آئے

جو فتح ہو تو کبھی اُس پہ شادماں نہ ہو
غرور و کبر سے سر میں نہ کچھ خلل آئے

مثالِ مرد ہر اک امتحان سے گذرے
لگے اگر کہیں ٹھوکر تو جھٹ سنبھل جائے

رہے جہان میں جب تک تو فکرِ کار رہے
اور آنکھ بیچ کے سو جائے جب اجل آئے

جو مستقِل ہو ارادے میں اس قدر ای دل
وُہ کیوں نہ باغ جہاں سے ہمیشہ پھل پائے

زمانہ خواہ کسی بیکس سے پھیر لے آنکھیں
مگر نہ اُس کا دلِ پُر وفا بدل جائے

از عبدالرشید چشتی مرحوم

قصیدۂ مدحیہ

حال میں ایک ڈپوٹیشن علیگڑھ کے طلبہ کی انجمن القرض کی طرف سے حیدرآباد گیا تھا وہاں مہاراجہ مُرلی منوہر آصف نواز ونت بہادر نے بکمالِ مہربانی ایک "ایٹ ہوم" ممبرانِ ڈپوٹیشن کو دیا۔ اُس جلسہ میں ہمارے دوست ظفر علیخاں صاحب بی۔ اے نے یہ پُرزور اور معنی خیز قصیدہ پڑھا:-

ہوا جب سر مرا کل شب کو وقفِ بالشِ راحت
مٹائی بیخودی نے ایک پل میں دن کی سب کلفت

کیا آزاد مجھ کو نیند نے فکرِ معیشت سے
غمِ دُنیا و مافیہا کے آڑے آگئی غفلت

بدن نے گرچہ تھک کر اوڑھ لی تھی چادرِ مستی
پہ اب تک رُوح میں باقی تھی بیداری کی کیفیت

تصوّر کے رفیقِ برق پا کی رہنمائی سے
مَیں پہنچا ایسے اک گلشن میں جو تھا غیرتِ جنّت

غزلخواں تھی یہاں بادِ صبا اوراقِ اخضر میں
پریشاں تھی یہاں گلہائے رنگارنگ کی نکہت

بہارِ گل ہمیشہ لبکہ اس گلشن میں رہتی تھی
عنادل کو بھی حاصل تھی یہاں خاطر کی جمعیت

وفورِ لالہ و نسریں نے پیدا دل کے کر دی تھی
خیابانِ چمن میں گوہر و مرجاں کی خاصیت

نظر آیا مجھے اس باغ میں اک قصرِ عالیشاں
کہ جس کے کنگرہ کو چھو نہ سکتی تھی مری ہمّت

قریب اس قصر کے دو ندّیاں پاکیزہ تھیں جاری
نہ تھی جنکی لطافت سے فُرات و گنگ کو نسبت

نگہ چاروں طرف دوڑا کے اس حیرت بخش منظر پر
یہ پُوچھا میں نے اپنے رہ نما سے اندرِ حیرت

یہ باغ اور ندّیاں کیسی ہیں اور یہ قصر ہے کس کا
کہ شرماتی ہے گردوں کو بھی جسکی عظمت و رفعت

جواب اس نے دیا کہتے دکن ہیں اس گلستاں کو
مثالی سارے باغوں سے ہے اس کی رونق و زینت

گل و نسرین و سنبل ہیں یہاں کے علم و فضل و فن
ہیں شمشاد و صنوبر اس چمن کے دانش و حکمت

ہیں صیّاد اس گلستاں کے کرم اور لطف اور احساں
یہاں کی بلبلیں اور قمریاں ہیں بخشش و نصفت

یہ ایواں جو نظر آتا ہے دن رات اس میں بجتا ہے
نظام الملکِ آصف جاہ کا نقارۂ شوکت

یہ دونوں ندّیاں جو بہ رہی ہیں سامنے مل کر
عیاں ان سے یہاں کے رہنے والوں کی ہے قومیت

مسلماں ایک ان دونوں میں ہے اور دُوسری ہندو
ملاپ انکا بتاتا ہے نہیں دونوں میں غیریت

علےٰ رغم الرجال الہند ان میں اُنس ایسا ہے
کہ رکھتے جس طرح ماں جائے بھائی ہوں باہم الفت

یہاں شیخ و برہمن کا ہے رشتہ چولی دامن کا
نہ اُس سے دشمنی اسکو نہ اس کو اس سے کچھ نفرت

مسلماں شہریار اس ملک کا ہے اور مسلماں بھی
وُہ ایسا ہے کہ ہے فاروقِ اعظمؓ سے جسے نسبت

وزیر اس ملک کا ہندو ہے اور ہندو بھی ایسا ہے
کہ جس سے فخر ہے سُورج کو اور ہے چاند کو عزت

سُنی جس وقت مَیں نے یہ کہانی اپنے ساتھی سے
ہُوئی اتنی خوشی مجھ کو ہُوئی ایسی مجھے فرحت

کہ فوراً آنکھ میری کھُل گئی اور جاگ اُٹھا مَیں
جو دیکھا تو نہ شب تھی اور نہ شب کا پردۂ ظلمت

جہاں میں ہر طرف چھایا ہوا تھا نور کا تڑکا
نمایاں ساحتِ خاور پہ تھی کافور کی رنگت

ابھی تک خوابِ شب کا نقش تھا لوحِ تصور پر
کہ لایا ایک پیکِ خوش خبر اک رقعۂ دعوت

مطلا خط میں جس پر ثبت تھا اک خوشنما طغرا
ٹپکتی جس کے ہر اک نقش سے تھی دولت و حشمت

میں مدعو اور داعی راجۂ مرلی منوہر تھے
سلیماں نے بڑھا دی چیونٹی کی قدر و قیمت

تصور میں نظر آیا تھا مجھ کو رات میں جو کچھ
ہوئی تصدیق اس کی روز روشن میں ز ہر قسمت

مسلمانوں کے تعلیمی مقاصد سے جان و دل
ہے اک ہندو کو ہمدردی بحمد اللہ و المنت

مزین ہے یہاں گلدستۂ قوم ایسے پھولوں سے
کبھی جن میں نہ ہم پاتے تھے رنگ و بوئے جنسیت

بلایا میں گیا ہوں آج ان لوگوں کے زمرہ میں
کہ جنکا مقصدِ عالی ہے ملک اور قوم کی خدمت

تکلف بر طرف نکلے ہیں گھر سے ہم گدائی کو
کہ حاصل قوم کے بچوں کو ہو تعلیم کی دولت

خصوصاً ایسے بچوں کو جو نادار اور مفلس ہیں
ہوا ہے جن کا شوقِ علم و فن شرمندۂ عسرت

ہزاروں کوس تک لائی ہے اس سرکار تک ہمکو
امیرانِ دکن کے بخشش و ایثار کی شہرت

نہیں ہے موتیوں کا کال گھر میں راجہ کے لیکن
ہمارے دامنِ حسنِ طلب میں چاہیے وسعت

ہماری جھولیاں بھر دیں دکن والے تو ہم جانیں
جھکانے لگ گئی سر سید احمد خاں کی سب محنت

ہے مسجد مدرسہ کی ناتمام اسکو ہی بنوا دیں
مسلمانوں میں اتنی بھی نہیں شاید رہی ہمت

مگر بھولے ہیں مضمونِ حدیثِ سرورِ عالم
بنائے جو کوئی مسجد وہ ہوگا داخلِ جنت

کھلی ہیں شاہراہیں ہر طرف علم و ترقی کی
مسلمانِ ہند کے گر اب بھی کھولیں دیدۂ عبرت

بہ آسانی یہ دفتر ختم ہرگز ہو نہیں سکتا
زباں میں اس قدر طاقت نہ اتنی کلک میں قدرت

خدا آباد رکھے حیدر آبادِ دکن تجھ کو
کہ اب تک تیرے صدقہ میں ہے قائم اپنی کچھ وقعت

ہمارے واسطے جبل المتیں ہندوستاں میں ہے
ابھی تک آصفِ گیواں حشم کا دامنِ دولت

ہمیں اس تاجور کی سرپرستی اور حمایت میں
خداوندا عطا کر دولتِ دینداری و حکمت

ترے نزدیک کیا مشکل ہے عظمت بخشنی ہم کو
بنا سکتا ہے جب اک دانۂ خردل کو توبرت

نہ بھولینگے مداراتیں دکن کی ہم کبھی - یارب
ہمارے میزباں پر سایہ افگن ہو تری رحمت

نہ ہو گا محو دل سے مدتوں تک آج کا جلسہ
رہے گی یاد برسوں تک ہمیں یہ لطف کی صحبت

ظفر علیخاں

تازہ غزلیں

حال میں اُردوئے معلّےٰ میں ایک شگفتہ طرح پر طبع آزمائی ہُوئی تھی - اس زمین میں اقبال و نیرنگ و اعجاز نے بھی اپنا اپنا زورِ طبیعت دکھایا ہے - یہ غزلیں قابلِ ملاحظہ ہیں :-

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
سرِ بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

حباب آسا سرِ موجِ نفس باندھا ہے محمل کو
ذرا دیکھ اے شررا! ذوقِ فنا مجھ کو کہاں تک ہے

وہی اِک شعلہ ہے تربت بھی ہے اور شمعِ تربت بھی
مزا مرنے کا کچھ پروانۂ آتش بجاں تک ہے

نہ سیکھی تو نے مرغِ رنگِ گل سے رمزِ آزادی
یہ قیدِ بوستاں بلبل! خیالِ آشیاں تک ہے

وہ مے کش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بنجاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی سو میرے آشیاں تک ہے

بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں!
نظر آسا مری وحشت میں بے تابی یہاں تک ہے

میں خارِ خشک پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہوں
پڑے رہنا مرا گلشن میں رحمِ باغباں تک ہے

وہ مشکِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے

مثالِ عکس بے تارِ نفس ہے زندگی میری
تری آسیب کاری ای اجل اقلیمِ جاں تک ہے

زباں تک عقدۂ تب خالہ بنکر رہ گیا مطلب
اثر مجھ دل جلے کی بستہ کاری کا کہاں تک ہے!

۸۱۹۴

جرس ہُوں مَیں صدا خوابیدہ ہے میرے رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے!

سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر
کہ عُقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

نہیں منّت پذیرِ چشم رونا شمعِ سوزاں کا
سمجھ غافل! گدازِ دل میں آزادی کہاں تک ہے

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل!
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے

بھلا اے گل کبھی اس رمز کو تو نے بھی سمجھا ہے؟
تری شبنم فریبی کیوں بہارِ بوستاں تک ہے

جوانی ہے تو ذوقِ آرزو بھی لُطفِ ارماں بھی
ہمارے گھر کی آبادی قیامِ مہماں تک ہے

زمانے بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی!
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

یہ ہے اقبال فیضِ یادِ نامِ مُرتضےٰ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

فریبِ آرزو و نیرنگِ تاثیرِ فغاں تک ہے
طلسمِ اعتبارِ عہد و پیمانِ بتاں تک ہے

دلِ عاشق سے پوچھو عشق کی تلخی کے چٹخارے
کہ زہرابِ محبت کی حلاوت کامِ جاں تک ہے

ڈبویا نخوتِ گوہر نے اُستادِ ملائک کو
رسائی خاک کی خلوت سرائے لامکاں تک ہے

قفس کھل جائے تو میں پر شکستہ ہی پہنچ جاؤں
کہاں کا فاصلہ ایسا قفس سے آشیاں تک ہے

چمن زارِ تصوّر ہی میں محوِ دیدِ گل ہوں میں
بہت تھوڑا تفاوت یاں قفس سے آشیاں تک ہے

بر آئیگی امیدِ بلبلِ آفت طلب ۔ یعنے
نہیبِ برقِ سوزاں آشیاں سے آشیاں تک ہے

خدا ہو آپ پر کوئی تو کس اُمّید پر آخر
وفا کا آپ کی خو میں کہیں نام و نشاں تک ہے؟

بہت ہمدرد یاں ہیں کوہکن کی تیشہ رانی سے
کبھی اے کاش دیکھو میری جاں کاوی کہاں تک ہے

تم اپنی دلنوازی کے بہت احسان جتاتے ہو
ذرا یہ بھی تو دیکھو میری جانبازی کہاں تک ہے

تیری توفیق یاور ہو تو سارے کام سیدھے ہیں
یہ ناکامی کا کھٹکا میری سعیِ رائگاں تک ہے

انہیں کر کے جُدا آرام سے سب بیٹھ جائینگے
عناصر کی کشاکش اتحادِ جسم و جاں تک ہے

وہ بے مہر اور غیروں سے وفا؟ کیونکر یقیں آئے
تکلف برطرف ہاں میرے رشکِ بدگماں تک ہے

میری نظروں میں زاہد اور ہی جلوے سمائے ہیں
نظر تیری تو حسنِ حور و غلمانِ جناں تک ہے

غزل میں لطف ہی اب کیا ہے لیکن کچھ جو باقی ہے
سو تقلیدِ ادائے غالبِ معجز بیاں تک ہے

کوئی نیرنگ لطفِ جدتِ مضموں تو دکھلائے
یہ اندازِ خصوصیت تو بس طرزِ بیاں تک ہے

نیرنگ

گلستانی ترے کوچہ کی چشمِ خونفشاں تک ہے
یہ شہرت حسن کی اس عشقِ رسوائی نشاں تک ہے

متاعِ کوششِ بے مدعا کی کیا خبر تجھ کو
تیری حدِ نظر اے بوالہوس سود و زیاں تک ہے

کہے ہیں تم دلوں کی بات کیونکر جان لیتے ہو
کشودِ کار یہ کیونکر رقیبِ بے زباں تک ہے

بٹھلاتے ہیں وہ پہلو میں۔ عدو تعظیم دیتے ہیں
یہ رنگ اس بزم کا نیرنگِ عشقِ بے زباں تک ہے

میں سرتاپا فغاں ہوں اور فغاں یک شعلۂ آتش
میرے تارِ نفس کی خیر ہی ضبطِ فغاں تک ہے

نہ خوئے بیوفائی ہے نہ شوقِ کج ادائی ہے
جفا و جور جو کچھ ہے خیالِ امتحاں تک ہے

یہ اپنی اپنی ہمت ہے تعرض کیا۔ خصومت کیوں
کسی کی دوڑ مسجد تک مری کوئے بتاں تک ہے

کہیں آرام سے سوئے۔ یہ شب بیداریاں کیوں ہوں
مری جاں! تم سے تو بدظن تمہارا پاسباں تک ہے

نصیبِ جنسِ کاسد ہے مصیبت کس مپرسی کی
خریداری متاعِ حسن کی بازارِ جاں تک ہے

مزا دیکھو! مہارِ ناقہ ہے خود دستِ لیلیٰ میں
مگر جوشِ عتابِ قیس جانِ سارباں تک ہے

غذا ہے خونِ دل میری۔ میں غم کھا کھا کے جیتا ہوں
میری تو زیست ہی جور و جفائے آسماں تک ہے

تنِ خاکی نہ کیوں برباد ہو جاں کے نکلنے سے
سرا کی ساری آبادی خیامِ کارواں تک ہے

اثر اُٹھا ہے۔ گو وہ سن بھی لیں میری فغاں یعنی
رسائی نالۂ بلبل کی گوشِ باغباں تک ہے

مرے دل سے کوئی پوچھے کوئی تیرا جگر دیکھے
خلش اس کم نگاہی کی کہاں تک ہو کہاں تک ہے

چھپے کیوں خضر جاکر پردہ دامانِ صحرا میں؟
ہراساں موت سے شاید کہ عمرِ جاوداں تک ہے

رگِ لیلےٰ ہے یہ - اے بیخبر فصاد ہوشوں سے
تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

وہاں جاکر تو رعبِ حسن میں سب بھول جاتی ہیں
یہ بیباکی تمناؤں کی بزمِ دوستاں تک ہے

یہ اندازِ بیاں کی گرمیاں سوزِ دروں سے ہیں
جب آتش دل میں روشن ہو تو شعلہ بھی زباں تک ہے

یہ غفلت کب تک اے اعجاز بس رختِ سفر باندھو
بہت تھوڑی سی اب فرصت رحیلِ کارواں تک ہے

اعجاز

کچکول

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
لہو آتا ہے جب نہیں آتا

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق میں یہ ادب نہیں آتا

(حامد علی خاں بیرسٹر ایٹ لا) — (میر)

گل چمن میں گل و سمن دیکھا
آج دیکھا تو باغ بن دیکھا

کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں
عاشقوں کا جلا وطن دیکھا

ذوقِ پیکانِ تیر میں تیرے
مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا

(ر) (ر)

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

(ر) — (ر)

کام پل میں مرا تمام کیا
غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا

سعیِ طوفِ حرم نہ کی ہرگز
آستاں پر ترے مقام کیا

تیرے کوچہ کے رہنے والوں نے
یہیں سے کعبے کو سلام کیا

(حامد علیخاں بیرسٹرایٹ لا)

(میر)

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس کی آنکھیں لگیں تو خواب کہاں

بیکلی دل ہی کی تماشا تھی
برق میں ایسا اضطراب کہاں

گریہ شب سے سُرخ ہیں آنکھیں
مجھ بلانوش کو شراب کہاں

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

(میر)

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
اپنی بلا سے بیٹھے رہے جب فقیر ہو

چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ شکلِ باغ
جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو

دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو

ایسا بھی اس کے گھر کو ہی آباد دیکھیو
جس خانماں خراب کا یہ دل مشیر ہو

(میر)

سمجھتے ہیں وہ فرض اس کی شکست
مرا دل بھی عہدِ وفا ہو گیا

وُہ صورت ہے دل کش کہ اس ظلم پر
زمانہ ترا مبتلا ہو گیا

غم و رنج و حرمان و اندوہ کو
میرا سینہ مُلکِ بقا ہو گیا

یہ تقوے جوانی میں سالک مگر
بُرے وقت میں پارسا ہو گیا

(ایڈیٹر)

(سالک)

جذبۂ شوق ہی بن جائے گا رہبر اپنا
جاؤ بس بس نہ بتا جاؤ مجھے گھر اپنا

یہی جنگل ہے یہی پاؤں یہی راہروی
یہی سودا ہے یہی کوہ یہی سر اپنا

کھوئے دن عمر کے آئینہ بنانے میں عبث
پہلے دل صاف کیا کیوں نہ سکندر اپنا

راز دیتے نہیں ہم دوست ہو یا دشمن ہو
حال کہدیتے ہو تم غیر سے کیونکر اپنا

ایک میری ہی پریشانی قسمت لکھکر
تہ کیا کاتب تقدیر نے دفتر اپنا

رازِ دل گم شدگی بسکہ کسی پر نہ کھلا
خود کیا کرتے ہیں افسوس ہم اکثر اپنا

(ایڈیٹر) — (سالک)

سچ کی بات سے آتی ہے کدورت دل پر
آئینہ بھاپ سے ہوتا ہے مکدر اپنا

واہ کس شان سے سالک کو نکالا تم نے
خوش رہو ہم بھی لئے جاتے ہیں بستر اپنا

(رر) — (رر)

ہنسی ہنسی میں محبت وہ آزماتے ہیں
چھری گلے پہ سرے رکھ کے مسکراتے ہیں

(سید علی سجاد) — (اشک عظیم آبادی)

ہے عجب سیرگاہ یہ دل بھی
کیسے کیسے خیال آتے ہیں

(رر) — (رر)

ہم اپنے دل کا دینا تم کو لاحاصل سمجھتے ہیں
نہیں دیتے ہیں دل اپنا جو دل کو دل سمجھتے ہیں

تصور میں نظر آتی ہیں ہم کو صورتیں کیا کیا
ہم اپنے گوشۂ تنہائی کو محفل سمجھتے ہیں

(رر) — (برق عظیم آبادی)

دکھ سہے ترک جو نظارۂ دلدار کیا
آہ دونا ہمیں پرہیز نے بیمار کیا

(رر) — (رند)

قتل کرنے سے تم ایسے ہوئے قاتل مشہور
کوئی مرجائے مگر نام تمہارا ہوگا

(رر) — (محشر دہلوی)

پسِ مردن محبت اپنے عاشق سے جتاتی ہیں
نہیں تابوت میرا اُٹھنے دیتی لپٹے جاتی ہیں

(رر) — (سخی دہلوی)

عرقِ ماء اللحم انگوری

اور

درازیٔ عمر

یہ امر تازہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ دو بزرگ ہم عمر عہدہ دار جو اتفاقِ حسنہ سے ایک ہی ضلع میں مقرر تھے ایک ہی ضرر میں مبتلا تھے ضعفِ دماغ اور تاریکیٔ چشم سر کا گھومنا چکرانا۔ تھوڑے کام سے دل چرانا جس روز دو چار گھنٹے بیٹھ کر کام کرنا پڑے سر درد ہو جاتا بھوک کا بند ہو جانا۔ ہاتھ پاؤں کا ٹوٹنے لگتا۔ اور کبھی گھر میں تخلیہ کا موقع ملے تو صبح کو کوفت اعضا شکنی معلوم ہوتا۔ چارپائی سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا۔ ایک صاحب نے عرقِ ماء اللحم کا استعمال شروع کیا اور دوسرے صاحب اور مختلف معالجہ ڈاکٹروں حکیموں کا کرتے رہے چند دنوں بعد عرق کے پینے والے کا رنگ سرخ ہو گیا اور زردیٔ چہرہ دور ہو کر گال جو جھکے ہوتے تھے پُر ہو کر رنگ جھلکنے لگا تو دوسرے مختلف ادویہ کے کھانے والے نے دوست کو تعجب سے پوچھا یار کیا بات ہے تم تو چار بجے کے بعد چھ سات بجے تک کچہری میں کام کرتے رہتے ہو۔ صبح دم دیکھو سویرے ہی اٹھ کر پھر ہوا خوری کے لئے تیار۔ یہ ماجرا کیا ہے۔

اس نے کہا بات یہ ہے کہ میں عرقِ ماء اللحم انگوری دو آتشہ ساختہ حکیم غلام نبی لاہوری پیا کرتا ہوں چنانچہ وہ شکر نہ کر سکے جھٹ تار دیا۔ عرق بھیجدو۔

اب اس ڈپٹی کلکٹر کا سارٹیفکیٹ ملاحظہ کیجئے جس نے مختلف سرجنوں اور معزز دوسرے حکما کا علاج کیا اور ناکامیاب رہا۔ دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیجدیجئے۔ سارٹیفکیٹ صحت یافتہ اصحاب کے بھیجدینگے۔

قیمت فی بوتل عا تین بوتل سے چھ بوتل لعہ فی درجن عسہ بذریعہ ریل منگوانے میں محصول کی کفایت ہو گی ریلوے سٹیشن معہ لائن صاف لکھیں ورنہ بذریعہ ڈاک منگوانے میں عہ۔

محصول ڈاک پیشگی آنا ضروری ہے +

پتہ :- حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور موچی دروازہ۔ (اعوان منزل)

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے - ملک کے مستند اور مشہور نامہ نگاروں کے علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہل قلم کی اسکی اعانت میں مصروف ہے - یونیورسٹیوں کی ڈگریاں پائے ہوئے اصحاب جنکو آجتک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا شوق سے اس کے بنانے میں شریک ہو رہے ہیں - اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا - جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری یافتہ اصحاب کیطرف سے نہ ہوں - مضامین علم دلچسپی کے ہوتے ہیں - اور کوشش کیجاتی ہے کہ ہر قسم کے مذاق کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو - رسالہ کا حجم ۲۲×۱۸ کی تقطیع پر (مع سرورق) چونسٹھ صفحہ کا ہے - **قیمت** عمدہ دبیز کاغذ پر بلا محصول (سے) اور دوم درجہ کے کاغذ پر (عا) ہے -

اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا جاتا - محصولڈاک ہر دو صورت میں چھ آنہ سالانہ ہے - درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پی ایبل کی اجازت آنی چاہئے - مابعد کا کوئی حساب نہیں - نمونہ کے پرچے کیلئے چار آنہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں ﴿ **شیخ عبد القادر** مالک و ایڈیٹر ﴾

نئی جلد اور ترقی

اکتوبر سے مخزن کی چھٹی جلد شروع ہوتی ہے - اور اس مہینے سے ایک خفیف سی ترقی شروع ہوئی ہے - یعنی موجودہ قیمت میں ہی چار صفحے اور مستقل طور پر بڑھا دئے گئے ہیں - گویا آئندہ رسالہ مع سرورق چونسٹھ (۶۴) صفحہ کا ہوا کریگا - اہل ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ اگر خریداران رسالہ ہماری حوصلہ افزائی کرتے رہیں تو ہم رفتہ رفتہ اس ارادے کو جو ابتدا میں ظاہر کیا تھا پورا کرکے رہینگے - کہ اس قلیل قیمت میں ہی باعتبار حجم و مضامین و دیگر صفات رسالہ ترقی کرتا رہے - شروع میں اڑتالیس صفحے تھے - اور پھر چھپن ۵۶ کر دئے گئے - اور اب ساٹھ کی نوبت آگئی - کیا عجب ہے کہ خدا کوئی دن لائے کہ ہم بغیر قیمت بڑھانے کے اور معقول اضافہ صفحوں کی تعداد میں دیکھیں - امید کہ ہمارے معاونین ہماری مساعی کا خیال کر کے خریداروں کے بڑھانے میں ساعی ہونگے - (عبد القادر)

دربار نمبر

دسمبر گذشتہ میں جو دربار نمبر شائع ہوا تھا - اس کے مضامین بجائے ۵۶ کے ۹۶ صفحہ پر آئے تھے - اور انہیں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا - اسکی کچھ زائد کاپیاں رکھی ہیں - جن حضرات کو شوق ہو جلد طلب فرمائیں - اس میں کی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں - قیمت ۸ بذریعہ ترسیل ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی پی طلب کیجئے - (مینیجر مخزن)